روشن زاویے

ڈاکٹر صادق نقوی

ریڈر شعبۂ تاریخ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

روشن زاویے

ڈاکٹر صادق نقوی

ریڈر شعبۂ تاریخ۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

ناشر :- باب العلم سوسائٹی ۔ حیدرآباد

سنہ اشاعت :- جولائی سنہ ۱۹۹۰ء مطابق ذی الحجہ سنہ ۱۴۱۰ھ

تعداد :- پانچ سو

کتابت :- میرزا عادل نجمی

سرورق :- علی ممتاز آرٹسٹ

طباعت :- رحیم پریس ۔ چھتہ بازار

مصنف کا پتہ :- ۱۶/۳۶۱ ۔ ۸ ۔ ۲۲ ۔ دارالشفاء ۔ حیدرآباد

۵۰۰۰۲۴ ۔ آندھرا پردیش

قیمت :- ۳۰ روپے

اپنے چچا ہندو پاک کے نامور صحافی و ادیب

محترم سید بادشاہ حسین نقوی

کے نام

جن کی محبت، شفقت اور تربیت نے مجھے

ادب کے راستہ پر چلنے کا سلیقہ عطا کیا۔

عرضِ صادق

یہ میرا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ "روشن لکیریں" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ "جذبۂ صادق" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جو میری مذہبی شاعری پر مشتمل تھا۔ اِن دونوں مجموعوں کی جو پذیرائی ہوئی میری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ جس کے لئے میں اربابِ ذوق کا ممنون ہوں۔

"روشن زاویئے" میرا تیسرا مجموعہ ہے جسے میں بڑے خلوص و احترام سے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں

شاعری مجھے اپنی والدہ محترمہ سکینہ بیگم عفّت مرحومہ کا ورثہ ہے۔ میرے والد بزرگوار مولوی سید احمد حسین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی اسپورٹس کے میدانوں میں گذاری۔ میرے چچا ہند و پاک کے نامور صحافی و ادیب مولوی سید بادشاہ حسین صاحب نے ابتدائی زندگی میں میری تربیت فرمائی۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ میں نے باپ اور ماں دونوں کا ورثہ پایا اور چچا کی تربیت سے پوری طرح فیضیاب ہوا۔

میری ابتدائی زندگی اسپورٹس کے میدانوں پر گزری۔ اسکول کی زندگی ہی سے مجھے کھیل سے ربط رہا۔ سٹی کالج کی کرکٹ ٹیم کا نمائندہ اور ٹیبل ٹینس ٹیم کا کپتان رہا۔ اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو حیدرآباد کی مشہور درسگاہ نظام کالج میں داخل ہوا۔ نظام کالج کی فٹبال کرکٹ اور اتھیلیٹک ٹیموں میں شامل رہا۔ ۱۹۵۸ء میں انٹر یونیورسٹی فٹبال ٹورنمنٹ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نمائندگی کے لئے منتخب ہوا۔ حیدرآباد کے دو مشہور ٹیموں حیدرآباد ریس کلب اور حیدرآباد آرسنل کلب کے نمائندہ کی حیثیت سے میں نے ہندوستان بھر میں کئی ٹورنمنٹس کھیلے۔ اسپورٹس سے یہ وابستگی کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی جاری رہی۔

۱۹۵۹ء میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کرکے اپنی ملازمت کا آغاز میں نے آل سینٹس ہائی اسکول سے کیا۔ جہاں ریاضی پڑھانے کے علاوہ مجھے کرکٹ ٹیم کی کوچنگ کا فریضہ بھی سونپا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں سینک اسکول کورکنڈہ وساکھاپٹنم منتقل ہوا۔ یہاں بھی ریاضی اور طبعیات پڑھانے کے ساتھ ساتھ مجھے اسپورٹس ڈائرکٹر اور این سی سی آفیسر کی زائد ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ۱۹۷۱ء میں سینک اسکول کورکنڈہ سے حیدرآباد پبلک اسکول بیگم پیٹ منتقل ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں بحیثیت

لکچر تقرر ہوا۔ اب بھی یونیورسٹی سے بحیثیت ریڈر وابستہ ہوں۔
یہ تو ملازمت کے سفر کی تفصیل تھی۔ اب مصروفیتوں کی تفصیل بھی سن لیجئے۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں، میں نے پھر سے تعلیم کا آغاز کیا۔ سنیک اسکول کی نوکری، کلاس میں ریاضی اور طبیعات پڑھانے کے ساتھ ساتھ اسپورٹس ڈائرکٹر اور این سی سی کی زائد مصروفیات کے باوجود میں نے علی گڑھ سے تاریخ میں ایم اے پاس کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پٹیالہ سے فٹبال میں ڈپلوما کورس کی تکمیل کی۔ پھر سنہ ۱۹۷۰ء میں سائنک اسکول سے حیدرآباد پبلک اسکول منتقل ہوا۔ اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے میں نے ایم فل کی تکمیل کی۔ این سی سی آرمی ونگ سے نیوی میں منتقل ہونے کے لئے کوچین میں دوماہ کی ٹریننگ کی۔ سنہ ۱۹۷۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کرتے ہوئے میں نے فارسی زبان کا ڈپلوما اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میری پی ایچ ڈی کا مقالہ "مسلم ادارے اور دورِ قطب شاہی میں ان کے کارنامے" پر تھا۔
عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنی اسپورٹس کی زندگی کو ترک کردیا۔ قلم جو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا زیادہ روانی کے ساتھ چلنے لگا۔
پچھلے بارہ سال کے عرصہ میں میرے (۲۶) مقالے تاریخ اور اردو ادب کے مقامین میں شائع ہوچکے ہیں۔ تاریخ کی ایک کتاب "حیدرآباد کے قطب شاہی عاشور خانے"

سال بھر محفلوں، جلسوں، مشاعروں اور مقاصدوں کا سلسلہ رہتا ہے۔ کوئی مہینہ ایسا نہیں ہوتا جس میں کوئی محفل نہ سجتی ہو۔ میں ان تمام میں بھرپور حصہ لیتا ہوں۔ اکثر جلسوں، سمیناروں اور سمپوزیمس میں بحیثیت مقرر مدعو کیا جاتا ہوں۔ مشاعروں اور مقاصدوں میں اپنا طرحی اور غیر طرحی کلام پیش کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے صرف اس لئے لکھا ہے کہ آپ کی خدمت میں اپنی زندگی کے شب و روز کا ایک خاکہ پیش کرسکوں اور آپ کی خدمت میں یہ عرض کرسکوں کہ میں نے شاعری کو کبھی بھی اپنا مقصد نہیں سمجھا میری شاعری میری مصروفیات کے درمیان میرے لئے ذہنی سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، میرے اپنے مشاہدہ، تجربہ اور احساس کا نچوڑ ہے۔

شاعری کی ابتداء میں نے ۱۹۵۵ء میں کی جب میں کالج کا طالب علم تھا۔ ابتداء میں علامہ نجم آفندی سے شرف تلمذ رہا۔ علامہ نے مجھے شاعری کا سلیقہ بھی عطا کیا اور اس راستے پر چلنے کے لیے میری ذہنی تربیت بھی کی۔ علامہ کی رحلت کے بعد میں نے کسی کو بھی اپنا استاد نہیں بنایا۔ اس لئے جو کچھ بھی آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں میری اپنی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے۔ البتہ مجھے میرے اپنے دوستوں سے قدم قدم پر جو مدد ملی ہے اس کے لئے میں اُن کا مشکور ہوں۔ ہم دوستوں کی بزم "بزمِ فردوسِ ادب" کا قیام تقریباً (۱۲) سال قبل ہوا

اب تک دو بار شائع ہو چکی ہے۔ دوسری اشاعت کی کچھ اب صرف چند کاپیاں باقی ہیں۔ انگریزی میں دو اور کتابیں "قطب شاہیوں کی مذہبی پالیسی" اور "قطب شاہی دَور کے صوفیائے کرام" زیرِ طبع ہیں۔ اِن کے علاوہ میں نے اب تک تیس قومی سمیناروں اور تین بین الاقوامی سمیناروں میں اپنے مقالے پیش کئے ہیں۔ حال ہی میں راس الخیمہ میں عرب، ہند تعلقات پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں، میں نے ہندوستان کی نمایندگی کی اور مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہ طویل مقالہ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں شائع ہو رہا ہے۔

علمی زندگی کی ان مصروفیات کے باوجود میں نے اپنی مذہبی و ادبی مصروفیات کو کبھی ترک نہیں کیا۔ پچھلے (۲۸) برس سے ذاکری کا شرف حاصل ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کئی مجلسوں کو مخاطب کر چکا ہوں۔ کئی ادبی اور سماجی انجمنوں سے وابستہ ہوں۔ حیدرآباد کے مشہور ادارے باب العلم سوسائٹی کا پچھلے (۱۲) سال سے سکریٹری ہوں اور ادارے کی سرپرستی میں نکلنے والے اسلامک ریسرچ جرنل "دی نور" کا پچھلے دس سال سے ایڈیٹر ہوں۔ یہ جرنل اب ساری دنیا میں صاحبانِ علم کی نظروں میں قابلِ قدر حیثیت کا حامل ہے۔ ادارہ نے اب تک (۷) کتابیں میری نگرانی میں شائع کی ہیں۔

حیدرآباد علمی، تہذیبی اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے۔

ان ۲۱ برسوں میں ہم لوگ ایک خاندان بن گئے ہیں۔ روز ملتے ہیں تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ علمی، ادبی اور شعری موضوعات پر کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے بھرپور استفادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یوں ہم "فردوسِ ادب" کے شعراء کا خاندان علمی راہوں پر کامیاب و کامران آگے بڑھ رہا ہے اور اسی ماحول میں رہ کر میں اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اپنی شاعری کو زندہ رکھے ہوئے ہوں۔

اس مختصر سے عرضِ حال کو ختم کرنے سے پہلے میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ میں اپنے سارے احباب کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کروں جنہوں نے اس دورِ کشش میں علمی و ادبی ماحول بنا رکھا ہے۔ میں خاص طور سے جناب ابراہیم حامی اور علامہ سہیل آفندی کا مشکور ہوں جنہوں نے مسودہ پر نظرِ ثانی کی زحمت گوارا کی میں اپنے دوست میرزا عادل نجمی کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت اور محبت سے اس مجموعہ کی کتابت فرمائی۔ میرے دوست علی ممتاز آرٹسٹ کا بھی میں شکر گذار ہوں جن کی فکر نے اس مجموعہ کے سرورق کی تخلیق کی ہے۔ جناب راحت عزمی کا میں مشکور ہوں جنہوں نے پیش لفظ لکھ کر مجھے ممنون فرمایا۔

جناب احمد عزمی

پیش گفتار

شعر اثر آفرینی اور معنویت سے عبارت ہوتا ہے۔ شعر کے لئے لفظوں کی تہذیب یا سجاوٹ ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بات دل سے نکلے اور دل میں اُتر جائے تو بات ہے۔ جس شعر میں یہ کیفیت ہو وہ شعر ہے ورنہ لفظوں کا مرتب ڈھیر ہے۔ شعر میں مکمل معنویت اور بھرپور تاثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کو اپنے اطراف کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی زندگی کا گہرا ادراک ہو اور وہ روزمرّہ کے واقعات کا شعوری سطح پر جائزہ لیتا رہے۔ اس کے نتائج کی سچائی اس کے اشعار میں خود اپنا رنگ بھرتی چلی جاتی ہے تب شعر، شعر کہلاتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حُسن خوش لباسی سے آزاد ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ سادہ لباس بھی اس سے مس ہو کر خوش لباسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شعر میں لفظوں کی تہذیب کا یہی موقف ہے۔ اصل شئے فکر کی صحت اور تجربہ کی صداقت ہے۔ سچائی کا اظہار چاہے جن لفظوں میں ہو اثر رکھتا ہے۔ اظہار میں سلیقہ ہو تو سونے پر سہاگہ ہے مثلاً انقلابِ زمانہ کے اس اظہار کو دیکھئے

"کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے ؎ ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے"

صرف دو معمولی لفظوں کی تکرار ہے لیکن تاثر اپنی جگہ برقرار ہے۔ زندگی کے ہے ہنگم شور سے کربناک چیخوں کو سمیٹنا عام ذہن کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس فرض کو وہی ذہن ادا کر سکتے ہیں جن کے قلب و دماغ نازک احساسات سے مملو ہوتے ہیں۔ زندگی کے تیز دھاروں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی مجبور زندگیوں کے درد کو سمجھنا اور اپنے موثر اظہار سے دوسروں کو بھی اپنا شریکِ درد بنانا آسان کام نہیں ہے۔ اس راستہ کو وہی شاعر طے کر لیتا ہے جو اپنے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل رکھتا ہے۔ دل سے جب ہوک اُٹھتی ہے تو خود بخود "آہ" کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ ابلاغ کی سچائی اور اس کا تاثر لفظوں کو خود بخود سمیٹ لاتا ہے۔ شاعر اسی اثر کے تحت انہیں ترتیب دے لیتا ہے۔ جب ہم کسی اچھے شعر کو سن کر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں "کیا بے ساختہ شعر ہوا ہے" تو اس شعر کی تحلیل میں یہی دیکھتے ہیں کہ ایک تاثر ہے جو خود بخود لفظوں میں ڈھل گیا ہے۔ اصل شاعری یہی ہے۔

جہاں تک اسلوب کا سوال ہے وہ اس شاعر کی ذہنی اپج کا تابع ہوا کرتا ہے۔ ہر شاعر کے سوچنے کا انداز مختلف ہوتا ہے شعر کی پیکر تراشی اسی نسبت سے ہوتی ہے۔ کوئی سہلِ ممتنع ہوتا ہے تو کوئی مشکل پسند۔ اسلوب اسی طرزِ فکر و اظہار سے متعین ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں اور

صداقتوں سے جب شاعر کا ربط غیر منطقی ہو جاتا ہے تو فکر ہچکولے کھانے لگتی ہے
ایسی شاعری میں اسلوب "لا لعینیت" کا شکار ہو جاتا ہے ۔ یہ صورت اس وقت
پیدا ہوتی ہے جب شاعر اور اس کی شاعری دو الگ الگ خانوں میں بٹ جاتی
ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر بھوک پر عمدہ شعر کہہ سکتا ہے اس کے لئے یہ ضروری
نہیں کہ خود اس نے کبھی بھوک کی اذیّت سہی ہو۔ یہ بات درست ہے لیکن اس
بھوک کی اذیّت کا تعلق شاعر کے ظاہری پیکر سے نہیں ہے بلکہ اس پیکر کے
اندر جو شاعر ہے وہ اس اذیت کو جانتا ہے اور بھوک پر اسی اندر کے شاعر کا
شعر ہوتا ہے ۔ شاعر کا ظاہری پیکر تو صرف آلۂ اظہار ہے ۔ اچھی اور سچی شاعری
وہیں ہوتی ہے جہاں شاعر اور شاعری دو خانوں میں تقسیم نہ ہو جس ذات میں
شاعر اور شاعری اکائی بن جاتے ہیں وہاں "لا لعینیت" کی بے چہرگی نہیں ہوتی ۔
اثر و معنی کی وسعت شاعر کے تجربہ اور مشاھدہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے،
اِن ساری باتوں کے تناظر میں جب میں ڈاکٹر صادق نقوی کی پھیلی ہوئی
شخصیّت کو سمیٹ کر شاعر کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں تو بڑی مشکل سے
دو چار ہو جاتا ہوں ۔ یہ مشکل اس لئے ہے کہ میں کھیل کے میدان کے صادق نقوی
سے جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ تاریخ کے ریڈر صادق نقوی تک جانتا ہوں ۔ نام سے تو
وہ ہر جگہ صادق نقوی رہے لیکن جس میدان میں دیکھا اُسی میدان کے مرد کھائی دیتے

رہے، دوسری جگہ نظر نہیں آئے۔ میرے اس جملہ کے سمجھنے میں قاری کو نسا مح
ہوسکتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے صادق نقوی کو فٹبال کے کھلاڑی
کے روپ میں دیکھا تو وہ فٹ بال ہی کے بہترین کھلاڑی نظر آئے۔ کرکٹ
کے میدان میں دیکھا تو کرکٹ کے بہترین کھلاڑی دکھائی دیئے۔ فٹ بال کے
میدان سے اوجھل ہو گئے۔ کیڈٹ کا یونیفارم پہن لیا تو وہ اسمارٹ سپاہی
نظر آنے لگے۔ میدانوں سے غائب ہو گئے۔ علمی میدان میں قدم رکھا تو ایسا
محسوس ہوا کہ اس شخص نے کبھی کھیل کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ سدا
کتابوں سے رشتہ ناطہ جوڑے رکھا۔ علمی گفتگو میں اپنے موضوع پر منطقی تسلسل
کے ساتھ کتابوں اور مخطوطات کے حوالوں کی وہ بھرمار کہ سامع پریشان ہو جائے
اور مرعوب بھی ہونے لگے۔ خطابت کے میدان میں ایسے منفرد مقرّر کہ سارے
مجمع سے اپنی بات منوا کر رہے۔ اپنی شیریں بیانی پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند
کروا ہی لیتے ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ اتنی تلخ نوائی پر بھی مجمع سے واہ واہ لیتے
ہیں۔ ذاکر ایسے کہ دلوں کو تڑپا دیں۔ جس ذات میں اتنے اضداد جمع ہو جائیں
اس کو سمیٹ لینا کتنا مشکل مرحلہ ہوگا۔

میں نے صادق نقوی پر سوچتے ہوئے ان کی صلاحیتوں میں اس
قدرِ مشترک کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے گرد دوسری تمام قدریں

گھومتی ہیں جو اِن کی صلاحیتوں کی صورت گری کرتی ہیں۔ صادق نقوی کی ذات کو ٹٹول ٹٹول کر اور انکے وجود کو کھنگال کھنگال کر جو قدر میں نے تلاش کی وہ ہے ان کا غم سے چھلکتا ہوا دل۔ اور یہ غم انہیں کربلا کی دین ہے صادق نقوی کی تکوین اسی غم سے ہوئی ہے وہ ایسے ماحول کے وارث ہیں جہاں آنکھ کھولی تو غمِ حسینؑ کی روشنی دیکھی۔

غم کی اس اعلیٰ قدر نے ان میں انسان دوستی، عزم، ہمت، استقامت، قوتِ برداشت، صبر و تحمل، سنجیدگی و متانت، غور و فکر، ارادوں میں اٹل رہنا، فیصلوں میں احتیاط برتنا، ناسازگار حالات کے مقابل ڈٹ جانا، دوسروں کے غم کو بانٹ لینا، ناگوار باتوں کو وہاں تک درگذر کرنا جہاں تک "انا" پر حرف نہ آئے۔ دراصل یہی وہ صفتیں ہیں جنہوں نے صادق نقوی میں اچھی شخصیت اور سچے شاعر کی تشکیل کی ہے۔

صادق نقوی ایک شاعر ہیں۔ ایسے شاعر جو اپنے وجود کو شاعری سے الگ نہیں رکھتے۔ ان کا خود کہنا ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں اور بعد سب کچھ۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہی سب کچھ ایک ہوئے ہیں تو شاعر بنے ہیں۔ صادق نقوی کا اپنے گرد و پیش کا تجربہ وسیع اور تجربہ بہت نازک ہوتا ہے۔ جب وہ شعر میں ڈھلتا ہے تو سامع یا قاری پہلے متاثر ہوتا ہے بعد میں اس شعر کے پردے میں چھپی ہوئی

گہری فکر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے

ساغرِ بن کر جن کی جوانی گردش کرتی رہتی ہے
اُن سے پوچھو کون سیہ راتوں میں کیونکر جلتا ہے

سماج کے اس گھناؤنے پہلو کی کس بھرپور تاثر کے ساتھ نقشہ کشی کی ہے۔
شعر کہنے کے تعلق سے صادق نقوی نے اپنے نقطہ نظر کو اس طرح ظاہر کیا۔

یہ چند لفظ ہیں صادق کی شاعری تو نہیں
سنبھل کے، سوچ کے کہتا تو شاعری ہوتی

خیرات ندیم مرحوم نے کہا تھا کہ :-

"لفظ تک اڑالینا خوب استفادہ ہے"

آج کل شاعروں کی کھیپ میں یہ جرم عام ہو چلا ہے کہ استفادہ کے نام پر
لفظوں کا سرقہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر ڈاکہ تک ڈالنے سے نہیں چوکتے ..

انیس علیہ الرحمہ کو تک کہنا پڑا تھا۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے گلشن کے خوشہ چینوں کو

غالباً صادق نقوی بھی اس تلخ و ناگوار تجربہ سے دوچار ہوئے تھے انہوں
نے دو اور دو چار کی طرح صاف صاف کہہ دیا اور لہجہ کی تلخی کو کم کرتے ہوئے

آمادہ نہیں ہوئے۔

تقسیم کر رہا ہوں میں اپنی متاعِ فکر
نسلاً فقیر زادوں کو خوشحال دیکھنے

سماج کی طبقہ واری کشمکش مُسلّم ہے۔ وہ طبقے کتنے قابلِ رحم ہوتے ہیں جن کے افراد حالات کی ضربوں سے چکنا چُور ہو کر وقت سے پہلے ضعیف ہو جاتے ہیں:

"ہم تو بچپن سے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں
غم نصیبوں کی جوانی کو جوانی نہ کہو"

کون نہیں جانتا کہ حق بات کہنا کتنا تلخ ہوتا ہے۔

یہ سوکھے زرد پتّوں کی کہانی کون لکھے گا
قلم کس کا ہے اتنا معتبر یہ دیکھنا ہوگا
وائے یہ قحطِ زبان و علم و دانش فکر و فن
معتبر کوئی بھی دانشور یہاں ملتا نہیں

شعلے، سورج، ریت، صحرا، ببول، سوکھے زرد پتّے، کانٹے، پیاس، تشنگی، کربلا، سوکھے پھول، تاریخ، صادق نقوی کے خاص استعارے ہیں۔ وہ ان استعاروں سے بھرپور مفہوم کو ادا کر دیتے ہیں۔

"شعلوں کے درمیان بھی گلشن کی آبرو یا۔ تپتی ہوئی زمیں پہ جلتے رہے ہیں پھول

سوکھے ہوئے ببول کے سایہ میں بیٹھ کر
گرمی سے دیکھیں آج سُلگتا ہے کون کون

جو تشنگی میں سمندر کا ظرف رکھتا تھا
اُسی کی راہ پہ چلتا ہے کارواں اپنا

وہ شخص جس کی لاش تھی صحرا کے درمیاں
دریا کا ظرف رکھتا تھا تشنہ لبی کے ساتھ

صادق نقوی نے اپنے اسلوب کے تعیّن کے لئے سب سے پہلے "روشن لکیریں" کھینچیں۔ ان روشن لکیروں میں ایک لکیر غزل کی سمت سے چلی آئی۔ دوسری "جذبۂ صادق" کی سمت سے۔ جب یہ دونوں روشن خطوط ایک نقطہ پر ملے تو اب جو زاویئے بنے وہ دو ہیں۔ ایک روشن زاویہ وہ ہے جو غزل کی سمت بڑھتا جارہا ہے اور دوسرا وہ جو مذہبی شاعری کی سمت متحرک ہے غالباً انہوں نے اسی استعارے کو یہی مفہوم دے کر "روشن زاویئے" نام رکھا ہے۔

روشن زاویئے غزلوں، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعۂ کلام صادق نقوی کے اسلوب، فکر اور اُن کے لفظیات و استعاروں کو متعین کر دیتا ہے صادق کا لب و لہجہ ترقی پسند ادب اور جدیدیت کے درمیان بہت

متوازن ہے اِسی لئے ان کا کلام سب کو مطمئن کرتا ہے۔ وہ پابند شاعری کے پابند ضرور ہیں لیکن نئے تجربوں کے مخالف بھی نہیں ان کی آزاد نظمیں اس کا ثبوت ہیں۔

صادق نقوی کی آزاد نظمیں زیادہ تر فلسفیانہ فکر کی حامل ہیں وہ اس میدان میں بھی پابند شاعری کے اس طرح پابند ہیں کہ کھڑے مصرعے کسی بحر کے ارکان کو کم یا زیادہ کر کے مرتب کرتے ہیں۔

روشن زاویئے زندگی کے مختلف زاویوں کو متاثر کن اور منطقی ربط کے ساتھ روشنی میں لاتے ہیں۔ مثالوں سے گریز کرتے ہوئے آخر میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ کامیاب شاعری کے لئے دو لکیروں کا ایک نقطہ پر مرکوز ہونا ضروری ہوتا ہے ایک لکیر وہ ہے جو بیان سے تعبیر کی جاتی ہے۔ دوسری لکیر وہ جو خیال کے سفر کو متعین کرتی ہے۔ جب یہ دونوں خطوط سچائی کے مرکز سے ظہور پذیر ہوتے ہیں تو روشن زاویئے وجود میں آتے ہیں۔

صادق نقوی نے جن روشن زاویوں کی تجسیم و تکوین کی ہے اُن کا مرکزی نقطہ سچائی ہے۔ اِسی وجہ سے ان کے اظہار میں سلاست اور خیال میں منطقی معنویت ہے۔ نیز سچائی کی رعنائی

ہر ایک روشن زاویئے کی وسعت پر چھائی ہوئی ہے۔

مجھے اس کے آگے اور کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ

"عطر خود ببوید"

یقین ہے کہ روشن زاویئے کی تمام ادبی حلقوں میں ہر زاویہ سے پذیرائی ہوگی۔ دعا ہے۔

"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"





سکوتِ شب کی تنہائی میں جو ہر بات کرتے ہیں
تمہارا ذکر ہوتا ہے تو پتھر بات کرتے ہیں

تمہیں خاموش نظروں کی زباں پڑھنا نہیں آتا
ہماری آنکھ کے آنسو بھی اکثر بات کرتے ہیں

یہی تاریخ ہے قانون ہے حق کی روایت ہے
زبانیں روک دی جائیں تو خنجر بات کرتے ہیں

ہوں محوِ خواب آنکھیں گر تو سمجھانے سے کیا حاصل
صدف کی آنکھ کھلتی ہے تو گوہر بات کرتے ہیں

جو قدموں میں رہیں تو آفتابِ ضوفشاں ہونگے
ہتھیلی پر جو آجائیں تو کنکر بات کرتے ہیں

پلٹ جاتے ہیں ساحل سے جو طوفانوں کے متوالے

تو کشتی دم بخود رہتی ہے لنگر بات کرتے ہیں

اگر ہوں ہاتھ میں پتھر تو شیشے کے مکانوں سے

نکل کر خون کے پیاسے ستمگر بات کرتے ہیں

جہاں بھی بات آئے حق پسندوں کے مسائل کی

تو ہم صادقؔ بڑی جرأت سے اکثر بات کرتے ہیں



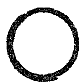
قطعہ

سنگِ مرمر میں ڈھلی کوئی غزل ہو جیسے

رودِ جمنا پہ کوئی تازہ کنول ہو جیسے

ایسے سوتا ہوں میں اوڑھے ہوئے خوابوں کی ردا

میرا مٹی کا مکاں تاج محل ہو جیسے



زباں خنجر کی کھلتی ہے ہنر خاموش رہتے ہیں

لہو کا مینہہ برستا ہے بشر خاموش رہتے ہیں

سکوتِ شب کی تنہائی میں جانے کون آتا ہے

فضائیں بول اٹھتی ہیں شجر خاموش رہتے ہیں

کبھی افلاس، غربت، تنگدستی چیخ اٹھتی ہے

کبھی ظلم و ستم کی زد پہ گھر خاموش رہتے ہیں

مروّت کی فضاؤں میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

جبیں پر بل تو آتے ہیں مگر خاموش رہتے ہیں

ہمارا درد بچوں کی زباں سے چیخ اٹھتا ہے

مگر گرتے ہوئے دیوار و در خاموش رہتے ہیں

کٹھن راہوں کے پتھر بات کرتے ہیں مسافر سے

مگر پہلو میں بیٹھے ہم سفر خاموش رہتے ہیں

بس اک سر تھا بدن سے کٹ کے بھی جو پڑھتا رہا قرآں

وگرنہ جسم سے کٹ کر تو سر خاموش رہتے ہیں

سنو کردار پر چڑھتی ہے بیٹی جب کبھی مفلس کی

تو صادق صاحبانِ سیم و زر خاموش رہتے ہیں



قطعہ

یہ پھول کی پتی پہ بنائے ہوئے چہرے

دریائے محبت میں نہائے ہوئے چہرے

حالات کے سورج کی تمازت سے جلے ہیں

بے آب چٹانوں پہ سجائے ہوئے چہرے



رہتا ہوں سمندر میں مگر پیاس لگی ہے

بادل کے برسنے کی بڑی آس لگی ہے

پھولوں کے ہے چہرے پہ ندامت کا پسینہ

کیا میرے چمن کو تری بو باس لگی ہے

خاموش نگاہوں میں ہے حالات کا شکوہ

ٹھہرائی ہوئی قوتِ احساس لگی ہے

وہ شب کی سیاہی سے نکلتا ہوا سورج

وہ دُور کی سوغات بڑی پاس لگی ہے

لکھا ہے فسادوں کی کہانی کو لہو سے

گرتی ہوئی دیوار بھی قرطاس لگی ہے

بستی بھی مری گھر بھی مرا لوگ بھی میرے

لیکن مری دنیا مجھے بن باس لگی ہے

بس خشک سے ہونٹوں پہ زباں پھیر دی اس نے

وہ کہہ نہیں سکتا تھا مجھے پیاس لگی ہے

صادق یہ سیہ خانۂ افکار میں آ کر

یونوں کو بلندی کی بڑی آس لگی ہے



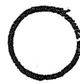
قطعہ

کتنے دلکش مقام آتے ہیں

تیری آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں

یوں بھی ہوتا ہے میری دنیا میں

لوگ پھولوں سے چوٹ کھاتے ہیں



توہین ہو رہی ہے صداقت شعار کی
پستی سے دیکھتے ہیں بلندی وہ دار کی

سینے کے زخم، دھوپ، یہ تپتی ہوئی زمیں
ہر چیز دے رہی ہے دہائی بہار کی

بس ایک بار آپ نے دیکھا تھا بزم میں
بدلی نہیں ہے آج بھی صورت خمار کی

دنگا، فساد، خون، ستم، درد لا دوا
تاریخ لکھ رہا ہوں ترے اختیار کی

بچے ہمارے صاحبِ کردار ہو گئے
کرتے نہیں ہیں بات سکون و قرار کی

وہ لوگ جن کا نام تھا تہذیب کی مثال
باتیں وہ کر رہے ہیں غمِ روزگار کی

خنجر چھپائے پھرتے ہیں احباب آجکل
بدلی ہوئی فضا ہے محبت کی پیار کی

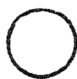
سوکھے ہوئے ببول کے سائے میں بیٹھ کر
منظوم کر رہا ہوں کہانی بہار کی

پیاسے بدن سے خون کا دریا تھا موجزن
رنگیں ہو گئی تھی زمیں کارزار کی

وہ شخص جس کے جسم پہ زخموں کی تھی ردا
تعریف کر رہا تھا وہ پروردگار کی

صادق ہو کہنے والا محبت کی بات ہو
صورت یہی ہے ایک فقط اعتبار کی

○



آنکھوں میں تشنگی تھی مکمل شباب تھا

وہ دن گئے کہ اپنا پسینہ گلاب تھا

دار المطالعہ تھا یہ شہرِ وفا کبھی

اس شہر میں ہر ایک کا چہرہ کتاب تھا

چونکا تو ایک نور کا دریا تھا سامنے

دیکھا تو دو قدم پہ مرے آفتاب تھا

وہ جس کے ہاتھ پھول کی پتّی سے کٹ گئے

نیچاروں کی نظر میں بڑا کامیاب تھا

کیچڑ کے پھول اونچے مکانوں میں جا بسے

میرے نگر میں ایک یہی انقلاب تھا

وہ جس کی فکر چاند ستارے سمیٹ لے
اپنے ہی گھر میں دفن وہ خانہ خراب تھا

لکھا ہے اُس نے خون سے پتھر کے فرش پر
قاتل بھی میرے دَور میں عزت مآب تھا

صادق تھا جس کا نام اُسے جانتے تھے لوگ
وہ بھی صداقتوں کے صحیفے کا باب تھا



قطعہ

منت سے عاجزی سے دعا مانگتے ہیں لوگ
اپنے غم و الم کی دوا مانگتے ہیں لوگ
خنجر سے لکھ رہے ہیں وہ امن و اماں کی بات
بہتے ہوئے لہو کا صلہ مانگتے ہیں لوگ



زندگی دیکھ کے موجوں کی روانی نہ کہو
میں بہل جاؤں گا ماضی کی کہانی نہ کہو

پیاس انسان کا لہو پی کے کہاں بجھتی ہے
خون کی پیاس کو تم تشنہ دہانی نہ کہو

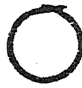
ہم تو بچپن سے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں
غم نصیبوں کی جوانی کو جوانی نہ کہو

کبھی پانی سے بھی جل جاتا ہے پھولوں کا شباب
زندگی دے نہ سکے جو اُسے پانی نہ کہو

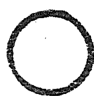
میں تو لفظوں کی حرارت سے بھی جل جاتا ہوں
واقعہ جو بھی ہوا اپنی زبانی نہ کہو

بات صادق کی کتابوں میں لکھی جاتی ہے
جھوٹ کو سچ نہ کہو سچ کو کہانی نہ کہو





تلاشِ میرؔ و غالبؔ اس جہاں میں
بہاریں ڈھونڈھتا ہے کیوں خزاں میں
نہ لفظوں کا تسلسل اور نہ آواز
صدا دیتا ہوں آنکھوں کی زباں میں
وہی اک نام ہے جس کا تسلسل
اشارہ بن گیا ہے داستاں میں
یہ منظر دیکھ کر روتا رہا ہوں
ہے پھولوں کا جنازہ گلستاں میں
یہ چودہ سو برس سے کہہ رہا ہوں
'جواب ان کا نہیں دونوں جہاں میں'
مری وحدت پرستی اللہ اللہ
سہارا ایک ہے دونوں جہاں میں
جو حق کی بات ہوتی ہے تو ہمدم
کہی جاتی ہے صادقؔ کی زباں میں



دل کی آواز ہے آنکھوں سے نکلتا پانی

داستانِ غم و آلام ہے بہتا پانی

ایک دریا ہے سمندر ہے مری تشنہ لبی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں صحرا میں برستا پانی

کوئی پتھر کبھی پانی میں نہ پھینکا جائے

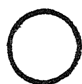
ایک شیشے کی طرح ہوتا ہے ٹھہرا پانی

دل کے دروازے پہ دستک کی صدا دیتا ہے

اُن کی آنکھوں کے کٹوروں سے نکلتا پانی

شعلۂ طور کے مانند اثر رکھتا ہے

میرے دامن پہ مری آنکھ سے بہتا پانی



جلتا رہا ہوں گردشِ ایام کے قریب
بھڑکا ہوا دیا ہوں میں انجام کے قریب

وہ شخص اس اندھیرے مکاں میں گذر گیا
سورج تراشتا رہا جو شام کے قریب

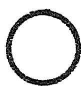
لکھا ہے کوئلہ سے کسی نے مرا بھی نام
تیرے مکاں کے در پہ ترے نام کے قریب

مٹی کے برتنوں کی سجائی گئی دکاں
پتھر کے سائبان تلے شام کے قریب

سورج کی فصل بو کے اندھیروں کے گاؤں میں
بیٹھا ہوا ہوں حسرتِ ناکام کے قریب

صادق جواں ہے رات چلو میکدہ چلیں
جھوٹی روایتوں سے پرے جام کے قریب





آپ کے دل میں نگاہوں میں نظر آئے گا
چڑھتا سورج ہے اُجالوں میں نظر آئے گا

بھول جانا تجھے فطرت سے بغاوت ہوگی
حُسن بن کر تو گلابوں میں نظر آئے گا

غم چھپاؤ گے تو چہرے پہ ملال آئے گا
درد آنکھوں کے دریچوں میں نظر آئے گا

کتنی بنجر سی زمینوں پہ چلا ہوں تنہا
پھوٹتے پاؤں کے چھالوں میں نظر آئے گا

ظلم تاریخ کے پردے میں کہاں چھپتا ہے
ظلم بوسیدہ کتابوں میں نظر آئے گا

ڈھونڈتے پھرتے ہو صادق کو کہاں بستی میں
جاؤ دیکھو وہ غزالوں میں نظر آئے گا





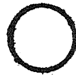
خشک پتّوں کی زباں کا رازداں کون آگیا
میرے حصّے کی زمیں پر باغباں کون آگیا

دفن ہے جس دیس میں تہذیب کا ننگا بدن
رات کے پچھلے پہر شاعر وہاں کون آگیا

کھٹکھٹاتا ہے کوئی دروازہ جب بھی رات میں
سوچتا ہوں اس اندھیرے میں یہاں کون آگیا

ہم تو چہروں کی زباں پڑھتے ہیں دن کی دھوپ میں
ہم سے پوچھو کس کی آنکھوں میں کہاں کون آگیا

خوبصورت لفظ بھی بکنے لگے بازار میں
جاؤ دیکھو تو یہاں اہلِ زباں کون آگیا



زندگانی کا سفر ہے ایک دن اور ایک رات

یہ کہانی مختصر ہے ایک دن اور ایک رات

یہ بلندی کا تصوّر رنگ و نکہت جھوٹ ہے

شاخ پر رہتا ثمر ہے ایک دن اور ایک رات

اُن کے چہرے کی دمک اور اُن کی زلفوں کا رچاؤ

معجزہ پیشِ نظر ہے ایک دن اور ایک رات

ساتھ تو دونوں چلے ہیں ہیں کبھی اور میرا نصیب

کون جانے رُخ کدھر ہے ایک دن اور ایک رات

میں کبھی ہوں نظروں کے آگے میرا مستقبل بھی ہے
دیکھ لیجے دربدر ہے ایک دن اور ایک رات

پارسائی بھی نہ جائے میکشی کے ساتھ ساتھ
کس قدر ابے پر بشر ہے ایک دن اور ایک رات

ساتھ صادق کے رہی ہے گردشِ دوراں مگر
فرق اب بھی معتبر ہے ایک دن اور ایک رات

قطعہ

اپنی تہذیب کی روداد بدل جاتی ہے
دل دھڑکتے ہیں محبت بھی مچل جاتی ہے
جب کسی درد کے مارے کا لہو بہتا ہے
چار میتار کی بنیاد دہل جاتی ہے



میرے صبر و قرار کی تاریخ

ہے ترے انتظار کی تاریخ

خشک پیڑوں کے سائے میں بیٹھا

لکھ رہا ہوں بہار کی تاریخ

ایک گلچیں نے لکھ کے چھوڑی ہے

گُل کی پتی پہ خار کی تاریخ

دیکھ ڈالے کئی کتب خانے

ڈھونڈھتا اعتبار کی تاریخ

تو نے نظریں اٹھا کے دیکھا تھا

میں نے پڑھ لی خمار کی تاریخ

تیرے نقشِ قدم سے بنتی ہے
ہر حسیں اعتبار کی تاریخ

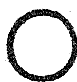
لوگ چہروں پہ آج پڑھتے ہیں
درد کی، غم کی، دار کی تاریخ

ظلم، خوں ریزی جنگ اور فساد
آپ کے اختیار کی تاریخ

ظلمتوں کے سیہ خانے میں
کون لکھے گا پیار کی تاریخ

آپ صادق کو کیا سمجھتے ہیں
اُس نے لکھی ہے پیار کی تاریخ

○



اے آبروئے جوشِ جنوں مدعا نہ مانگ
یہ زخم کائنات ہیں ان کی دوا نہ مانگ

گلشن کو خون دے کے رہے سرخرو جنوں
بہتے ہوئے لہو کا کسی سے صلہ نہ مانگ

یہ زندگی ہے کشمکشِ ہست و بود سے
اس دورِ کشمکش میں سکوں کی فضا نہ مانگ

اے باغبانِ گلشنِ نو یہ فضول ہے
کانٹوں کی فصل بو کے گلوں کی دعا نہ مانگ

میں اپنے بانکپن کو سمجھتا ہوں خود دلیل
مجھ سے کوئی دلیل خدائے وفا نہ مانگ

تقسیم کر رہا ہوں میں دولت خلوص کی

وہ یہ بتا رہے ہیں کہ کیا مانگ کیا نہ مانگ

صادق وفا کے باب میں تیرا بھی نام ہے

اس مصلحت نواز جہاں سے وفا نہ مانگ



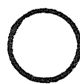
قطعہ

ہر شخص کے ماتھے پہ سیہ رات لکھی ہے

پھولوں کی گذرگاہ بھی کانٹوں سے سجی ہے

اِس دَور میں تاریخ کی بنیاد بدل دو

یہ خون سے لکھی ہے اجالوں میں جلی ہے



کتنا آسان بنا دیتے ہیں فرمانِ حیات
گرتی دیوار پہ لکھ دیتے ہیں عنوانِ حیات

وقت شیشہ کے مکانوں کو گرا دیتا ہے
صاف لفظوں میں یہ ہوتا رہا اعلانِ حیات

ہم جہاں رہتے ہیں تہذیب وہاں ملتی ہے
اپنے اخبار میں لکھ دیجے یہ فرمانِ حیات

احتراماً تجھے القاب لکھا کرتا ہوں
ورنہ اس شہر میں کوئی نہیں سلطانِ حیات

جن کے چہروں پہ لکھا ہے کہ پریشان ہیں وہ
محفلِ شعر میں ہوتے ہیں غزلخوانِ حیات

اب تو بچوں کو کھلونے بھی نہیں دے سکتے

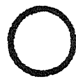
پھر بھی جی لیتے ہیں ہم لوگ بہ عنوانِ حیات

ایک دو، شعر کے مجموعے، قلم اور کاغذ

آج کے دور میں شاعر کا ہے سامانِ حیات

یہ غنیمت ہے کہ کچھ لوگ ابھی باقی ہیں

جن کی نظروں میں ہے، صادق یہی بادانِ حیات



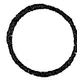
قطعہ

میں ٹوٹ کے بہتا ہوا دریا تو نہیں ہوں

صحرائے تمدن کا اجالا تو نہیں ہوں

حالات کا پتھراؤ ہے مجمع میں کھڑا ہوں

فولاد کا جوہر ہوں میں شیشہ تو نہیں ہوں



میری آنکھوں نے چُن لئے کانٹے
پھول کے پاس ہی ملے کانٹے

میں کبھی ایسا ہی ایک راہی ہوں
پاؤں میں جس کے چبھ گئے کانٹے

کون جانے چمن پہ کیا گزری
خون میں تر بہ تر ملے کانٹے

اُن کے دامن سے میرے دامن تک
پھول ہیں اور ملگجے کانٹے

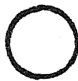
ایک ایسا بھی دَور آیا ہے
خوبصورت لگے مجھے کانٹے

سوچتا ہوں کہ مصلحت کیا ہے

پھول مرجھا گئے کھلے کانٹے

میں نے صادق چمن سنوارا ہے

خون پی کر مرا پلے کانٹے



قطعہ

یہ کس کا گھر جلا ہے کوئی جانتا نہیں

کیسے دھواں اٹھا ہے کوئی جانتا نہیں

اک لاش ہے غریب کی کب سے پڑی ہوئی

یہ کون مر گیا ہے کوئی جانتا نہیں



رات گذری تو شہیدانِ وفا بھی آئے
اوڑھ کر جسم پہ زخموں کی ردا بھی آئے

دھوپ آنکھوں میں جو چبھنے لگی نشتر کی طرح
کھڑکیاں کھول کے رکھنا کہ ہوا بھی آئے

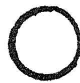
میں سرِ شام ہی سوچا تا ہوں بچے کی طرح
پاس اگر گردشِ ایّامِ بلا بھی آئے

رنگ سے حسن کا رشتہ ہے ترا یوں مضبوط
نام لکھّوں جو ترا رنگِ حنا بھی آئے

یہ روایت ہے دکھن کی اسے زندہ رکھنا
مسکراتے ہوئے ملنا جو قضا بھی آئے

یہ تو لفظوں کے کھلونوں کی دکاں لگتی ہے
اس غزل میں مرے بچوں کی صدا بھی آئے

لو لکھو دل کے فسانے کا خلاصہ صادق
اپنے قاتل کے لئے حرفِ دعا بھی آئے



وہ شخص جو تلوار کے سائے میں کھڑا ہے
اُس شخص کے ہونٹوں پہ پیمبر کی دعا ہے

ہے جس کے تصرّف میں یہ چڑھتا ہوا سورج
وہ ڈوبتے سورج کا پتہ پوچھ رہا ہے

بس ایک ہی تحفہ ہے ترے پیار کا باقی
دیوار پہ سرخی سے ترا نام لکھا ہے

کشتی کو حقارت سے مری دیکھنے والے
تو بھی تو سمندر کے کنارے پہ کھڑا ہے

جو طنز کے نشتر سے لگایا تھا کسی دن
وہ زخم مرے دوست ابھی تک بھی ہرا ہے

لفظوں کے لبادے میں ہے اخلاص کی دولت
ہونٹوں پہ بھی قاتل کے لئے حرفِ دعا ہے

صادق یہ ہمالہ کی بلندی کا تصوّر
میری ہی بلندی نے زمانہ کو دیا ہے



زندگانی سنوار کر رکھ دو
یہ لبادہ اتار کر رکھ دو
کچھ تو ہو پتھروں کی بستی میں
ایک گلشن نکھار کر رکھ دو
اب تعارف کی کیا ضرورت ہے
اپنا چہرہ اتار کر رکھ دو
اب تو چہروں کو پڑھ کے لکھنا ہے
یہ کتابیں سنوار کر رکھ دو
کس کو درکار ہے غم دوراں
ہر گلی میں پکار کر رکھ دو
یہ دو روزہ حیات ہے صادق
جس طرح ہو گزار کر رکھ دو





کبھی ماضی میں لَوٹو گے تو دردِ لا دوا ہوگا
زباں کا زخم ہے جتنا چھپاؤ گے ہرا ہوگا

میں لفظوں کے سمندر سے یہ موتی ڈھونڈ لایا ہوں
لُٹا دوں گا تری محفل میں جب کبھی سامنا ہوگا

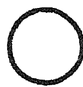
جب آؤ گے تو گلشن کی بہاریں جا چکی ہوں گی
یہ مانا آپ کا وعدہ بہر صورت وفا ہوگا

یہ ٹوٹے جام بہتی مے قیامت کا یہ سنّاٹا
یہ میخواروں کی محفل میں نہ جانے کیا ہوا ہوگا

یہ سوکھے زرد پتّوں کی کہانی کون لکھے گا
قلم کس کا ہے اتنا معتبر یہ دیکھنا ہوگا

میں صادقؔ عظمتِ تاریخ کی یا نہو میں جیتا ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے کہاں کیا واقعہ ہوگا





یہ بھی ہے حادثہ مری دیوانگی کے ساتھ
بے چہرگی کا درد ہے لیکن خوشی کے ساتھ

مالک دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں اس لئے
تیرے کرم کی آس رہے زندگی کے ساتھ

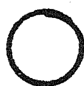
چہرہ کھلی کتاب ہے خطاطِ وقت کا
نظروں میں ہو شعور اگر روشنی کے ساتھ

اک پھول جس کے ساتھ ہے خوشبو کا قافلہ
کمرے میں رکھ گیا ہے کوئی سادگی کے ساتھ

وہ شخص جس کی لاش ہے صحرا کے درمیاں
دریا کا ظرف رکھتا تھا تشنہ لبی کے ساتھ

صادقؔ صداقتوں کے اُجالے کی بات ہو
لیکن یہ شرط ہے کہ رہے شاعری کے ساتھ





تری نگاہ کی مستی شراب جیسی تھی
مرے مزاج کی حالت شباب جیسی تھی

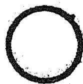
میں تیری دید کے آگے نہ بڑھ سکا ورنہ
ترے بدن کی کہانی کتاب جیسی تھی

نظر اُٹھائی مگر تجھ کو دیکھ بھی نہ سکا
کہ تیرے رُخ کی ضیا آفتاب جیسی تھی

مری نظر کا تقاضہ سوال جیسا تھا
تری نگاہ کی شوخی جواب جیسی تھی

وہ ایک پیار کا لمحہ جو ساتھ گزرا تھا
اُس ایک لمحہ کی قسمت حُباب جیسی تھی

سمجھ سکا نہ زمانہ کبھی مجھے صادق
مری ہنسی بھی مکمل نقاب جیسی تھی





وقت تھم کر دیکھتا ہے شانِ فرمانِ حیات

لکھ رہا ہوں ریت پر تفسیرِ عنوانِ حیات

ہم تو پتھر کے جگر رکھتے ہیں لوہے کے بدن

ہم سے ٹکرا کر پلٹ جاتے ہیں طوفانِ حیات

آپ کی شائستہ نظروں سے سلیقہ مانگ کر

ہم سجا لیتے ہیں تنہائی میں ایوانِ حیات

امن کی سرخی لگا کر یہ خبر چھاپی گئی

پھر غریبوں کا لہو مانگے ہے دامانِ حیات

کر رہا ہوں یہ غزل منسوب تیرے نام سے

اے غموں کی دھوپ میں پلتی ہوئی جانِ حیات

ایک مجموعہ غزل کا کچھ کتابیں اک قلم

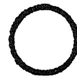
آج کے شاعر کا ہے اتنا ہی سامانِ حیات

سوچتا ہوں تجھ کو کیا کہہ کر پکاروں بزم میں

زرد پھولوں کی جوانی ظرفِ نگرانِ حیات

خنجروں کی زد پہ صادق پیار کی باتیں کرو

یہ وفاداری کا مسلک ہے یہ اعلانِ حیات



قطعہ

شدتِ غم سے جو ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہے

تیری تصویر نگاہوں میں چلی آئی ہے

یاد آتا ہے ترا چاندنی راتوں سا بدن

چاند دیکھا ہے تو آنکھوں میں نمی آئی ہے



کچھ اتنی بھیڑ تھی جسموں کی راستہ نہ ملا

میں چہرہ چہرہ پھرا کوئی رہنما نہ ملا

وہ لوگ چاند ستاروں کی بات کرتے ہیں

جنہیں زمین کی وسعت کا کچھ پتہ نہ ملا

یہ زرد سوکھے ہوئے پھول جیسے چہرے ہیں

جنہیں بہارِ چمن کا کوئی صلہ نہ ملا

چلو کہ زر کو خدا ہم بھی مان لیتے ہیں

مگر یہ غم تو رہے گا ہمیں خدا نہ ملا

میں آگ ہوں شبنم سے کیا بجھاؤ گے

میں صحرا صحرا چلوں گا جو مدعا نہ ملا

سُنا ہے دُور کہیں کوئی شخص رہتا ہے

جسے لہُو کی تجارت کا کچھ صِلہ نہ ملا

مجھے تلاش کرو پتھروں کے سینے میں

مرے وجود کا تم کو اگر پتہ نہ ملا

میں تیرے حُسن کو اپنی نظر بھی دیدوں گا

ترے قریب جو آنے کا اک بہانہ ملا

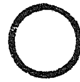
بہت قریب سے پازیب کی صدا آئی

نظر اٹھائی تو اپنا مجھے پتہ نہ ملا

بس ایک وہم ہے صادق حیات کچھ بھی نہیں

خدا کا شکر کرو تم کو مرتبہ نہ ملا





صداقتِ غم و آلام ہے بیاں اپنا
بھڑکتی آگ کے شعلوں میں ہے مکاں اپنا

یقین آپ کے وعدوں پہ آگیا لیکن
عجیب بات ہے دل خود ہے بدگماں اپنا

وہ ٹوٹتا ہوا لمحہ ہے بہتا دریا ہے
جسے حیات نے سمجھا ہے رازداں اپنا

میں انقلاب کے نقشِ قدم ابھاروں گا
اگر حیات کو ترسے گا کارواں اپنا

اسے خیال کی لغزش کہو کہ اہلِ جہاں
سمجھ رہے ہیں سہارا ہے آسماں اپنا

زمیں سے تا بہ فلک روشنی کا دھارا ہے

ہمیں یقین ہے چلتا ہے آشیاں اپنا

جبیں کو شوق ہے سجدوں کا دل کو ذوقِ نماز

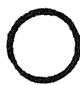
مگر یہ شرط ہے دکھلا دو آستاں اپنا

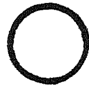
جو تشنگی میں سمندر کا ظرف رکھتا تھا

اُسی کی راہ پہ چلتا ہے کارواں اپنا

وہ جس نے سرحدِ ظلم و ستم کو کاٹا تھا

زبانِ خلق تھا صادق وہ بے زباں اپنا





بول سکتا ہوں مگر احساس دامنگیر ہے

میرا اندازِ تکلّم خود مری زنجیر ہے

آپ آئے پاس بیٹھے بات کی رخصت ہوئے

سوچتا ہوں خواب ہے یا خواب کی تعبیر ہے

ٹوٹتی سانسوں کا دریا بہتی سانسوں کا مزاج

اے فسانہ سازِ ہستی یہ مری تقدیر ہے

ریت کی دیوار کے سائے میں کٹتی ہے حیات

کس قدر روشن ہمارے خواب کی تعبیر ہے

لفظ سوکھے زرد پتّوں کی طرح بکھرے مگر

اُن کو پھر بھی ناز ہے سلجھی ہوئی تقریر ہے

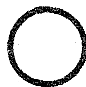
کوئی آئے گا جہاں میں صُلح کا پیغامبر
رات کے ماتھے پہ یہ لکھی ہوئی تحریر ہے

اے سمندر کے خدا کرتا ہوں شبنم کا سوال
دھوپ ہے صحرا کی میرے پاؤں میں زنجیر ہے

معجزہ کہتے ہیں اِس کو حُسن کا اہلِ نظر
بدلیوں میں چاند ہے پھیلی ہوئی تنویر ہے

موت کی باہوں میں مجھ کو آرہا ہے یہ خیال
ہچکیاں ہیں موت کی یا ٹوٹتی زنجیر ہے

لکھ رہا ہوں پھر نئے انداز سے اپنی غزل
لفظ تو صادقؔ وہی ہیں پر نئی تعمیر ہے





دیکھنے والوں کا انداز بدلتا کیسے
کھوٹا سکہ بھلا بازار میں چلتا کیسے

قتل لفظوں کے بھی خنجر سے ہوا کرتا ہے
ورنہ تقریر کی صورت میں وہ ڈھلتا کیسے

ظلم اور خون کے بادل تھے چمن پر چھائے
ان فضاؤں میں شجر پیار کا پھلتا کیسے

غم اگر دل میں نہ ہوتا تو تری محفل میں
درد آنکھوں کے کٹوروں سے اُبلتا کیسے

میرے افلاس نے مجبور کیا تھا ورنہ
عید کے دن مرا معصوم مچلتا کیسے

آبلہ پائی تری عظمت و ہمت کے نثار

خارزاروں پہ میں اس شان سے چلتا کیسے

علم کی راہ پہ میں بھی ہوں چراغوں کی طرح

ورنہ اشعار کے فانوس میں جلتا کیسے

ایک اُس نام کا صدقہ ہے وگرنہ صادقؔ

ٹھوکریں کھا کے زمانے میں سنبھلتا کیسے



قطعہ

چراغ آندھیوں میں جلاؤ تو جائیں

غمِ زندگی بھول جاؤ تو جائیں

ہو حسرتوں کا نگاہوں میں بھر کر

ہماری طرح مسکراؤ تو جائیں



دل میں تمہاری یاد کے جذبے مچل گئے
پھر لفظِ احتیاط کے معنیٰ بدل گئے

دیکھا ہے ہر دکان کا شوکیس بار بار
ہم اپنی آرزوؤں کے سایہ میں پل گئے

گرتے کبھی ٹوٹتے کبھی تڑپتے کبھی راہ پر
اک نام آگیا جو زباں پر سنبھل گئے

فکرِ سخن ضمیر کے قاتل کا حق نہیں
بھڑکی جو آگ ذہن میں الفاظ جل گئے

یہ انقلاب میری زمیں پر ہوا تو ہے
لوہے کے جسم موم کے سانچوں میں ڈھل گئے

معصوم آرزوؤں کی قاتل ہے مفلسی
دن عید کا تھا اور مرے بچے مچل گئے

اردو کے تاجروں کی دکانیں سجی رہیں
اربابِ فکر و فن تو اجالوں میں جل گئے

محفل کا رنگ دیکھ کے میں خود ہی اُٹھ گیا
دو چار لفظ اُس نے کہے تھے جو کھل گئے

شعر و ادب کی دنیا میں تغلق کا دور ہے
سکّے جو بے ثبات تھے دیکھو وہ چل گئے

سورج کی ہر کرن سے اجالے کا ربط ہے
جب ہم چلے تو وقت کے تیور بدل گئے

اپنی حیات دن کے اجالے میں رات ہے
ہم مسکرا رہے تھے یہ آنسو نکل گئے

صادقؔ ہمارے دور کی تاریخ میں لکھو
ہم اُن کی بزمِ ناز میں لے کر غزل گئے





دوستوں سے بھی محبت کا ہے رشتہ کتنا
اپنے ہی شہر میں رہتا ہوں میں تنہا کتنا

میری چوکھٹ پہ مرے پاس ہی رہتی ہے سدا
موت کو بھی ہے تقاضے کا سلیقہ کتنا

اپنے کمرے ہی میں رکھی ہے تمہاری تصویر
اجنبی پھر بھی مجھے لگتا ہے چہرا کتنا

موم کے دل ہیں یہ فولاد صفت سینوں میں
ہم کو دیکھو کہ ہے جینے کا سلیقہ کتنا

اپنے بچوں کو کھلونے بھی نہیں دے سکتے
حسرت و یاس سے محکم ہے یہ رشتہ کتنا

تم نے دو لفظ کہے تھے تمہیں احساس نہ تھا
شیشۂ دل انہی لفظوں سے ہے ٹوٹا کتنا

جب بھی اخبار کو پڑھتا ہوں تو آتا ہے خیال
میری دنیا میں ہے تاریک سویرا کتنا

جذباتی جو کیا جاتا ہے مجھ کو صادق
یاد آتا ہے وہ معصوم سا بچہ کتنا



قطعہ

کتنے منظر مری آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں
عکس بنتے ہیں بگڑتے ہیں بکھر جاتے ہیں

دن گذرتا ہے تری راہ پہ پتھر کی طرح
رات آتی ہے تو غم اور بھی بڑھ جاتے ہیں



جب کبھی اس کے خد و خال بتایا کیجے
کتنی آنکھوں میں وہ رہتا ہے، یہ دیکھا کیجے

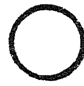
ہاتھ اپنے بھی ہیں پتھر بھی اٹھا سکتے ہیں
پر ہمیں پاسِ مروّت ہے اسے کیا کیجے

شوق سجدے کا اگر ہے تو خلوصِ دل سے
اُس کی چوکھٹ پہ فقط ایک ہی سجدا کیجے

ایک لمحے کا تبسّم ہے تمنائے حیات
آپ کو شک ہو تو گلشن کا نظارا کیجے

پیاس ظاہر ہو تو توہینِ وفا ہوتی ہے
راہ میں آئے جو دریا تو کنارا کیجے

میں تو صادق ہوں مجھے یاد ہے اپنا منصب
"اپنے بارے میں ذرا آپ بھی سوچا کیجے"



یہ کتابِ ہستی پرجانے کس نے لکھا ہے

موت زندگانی کا آخری کنارا ہے

جب سے پھول کی پتّی تم نے خط میں بھیجی ہے

تب سے میرے کمرے میں خوشبوؤں کا چرچا ہے

میں تو سنگ ریزوں کو آفتاب کرلوں گا

تم کو سوچنا ہوگا کس کے گھر اُجالا ہے

جسم بکتے دیکھے ہیں ہم نے چند پیسوں میں

یاں ضمیر بکتے ہیں یہ عجیب دنیا ہے

جن پہ تم نے انگلی سے میرا نام لکھا تھا

میں نے ان کتابوں کو اپنے ساتھ رکھا ہے

روشنی کے سوداگر دھوپ کو ترستے ہیں

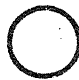
اِن سلگتی آنکھوں نے یہ بھی حال دیکھا ہے

میکدے کا دروازہ ماں کی گود ہوتا ہے

درد میں مسیحا ہے غم میں اک سہارا ہے

اُس کو کہتے ہیں صادقؔ جو قضائے ہستی ہیں

دار کی بلندی سے حق کی بات کہتا ہے



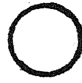
قطعہ

جس نے توڑا تھا مرا در وہ مرا بھائی تھا

جس نے لوٹا تھا مرا گھر وہ مرا بھائی تھا

میرے ہر زخم سے صادقؔ یہ صدا آتی ہے

جس کے ہاتھوں میں تھا خنجر وہ مرا بھائی تھا



کھلے گلاب کے چہرے پہ دلکشی لے کر
وہ میرے ساتھ ہیں پھولوں کی تازگی لے کر

شراب نہ ہی سہی آسرا تو بنتی ہے
حیات کاٹ رہا ہوں میں بیخودی لے کر

وفورِ شرم سے دریا کی آنکھ بھر آئی
پلٹ گیا تھا وہ دریا سے تشنگی لے کر

بدل رہا ہوں میں بازار کے اصولوں کو
اُجالے بانٹ رہا ہوں میں تیرگی لے کر

تضادِ حُسن بنا جب وہ پاس آئے ہیں
غرور آنکھوں میں چہرے پہ سادگی لے کر

حسین "تاج" پہ جیسے سحر کا آنچل ہو

میں ایسے آیا ہوں محفل میں شاعری لے کر

زباں کا زخم ہے ہر حال میں ہرا ہو گا

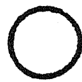
تمہارا طنز رہے گا مری خوشی لے کر

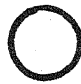
ہمارے چہرے صحیفے ہیں زندگانی کے

انہیں پڑھو تو سبھی دل کی روشنی لے کر

بس اک نظر ترے چہرے کو دیکھ لے صادق

وہ ایک لمحہ عطا کر یہ زندگی لے کر





زمیں کب تک رہے گی تنگ دشمن آسماں کب تک
مرے سینے سے اُٹھے گا الٰہی یہ دھواں کب تک

چلو ساغر کی تہہ میں دفن کر دیں رنج و غم اپنے
مسرّت کا ہر اک لمحہ نصیبِ دشمناں کب تک

عبارت ہے غموں سے زندگانی مان لیتا ہوں
مگر مالک مری بستی سے اُٹھے گا دھواں کب تک

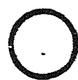
گزرتا وقت ہے ٹھہرا ہوا ہے کارواں اپنا
بتاؤ ہم صفیرو یہ ثباتِ کارواں کب تک

یہ مٹی کے بدن شیشے کے ایوانوں میں رہتے ہیں
ہمارے ہاتھ میں پتھر رہیں گے رائیگاں کب تک

چلو اب جراحتِ اہلِ جنوں کی بات سمجھائیں
جہانِ آب و گِل میں نالہ و آہ و فغاں کب تک

ہزاروں سال گذرے آنکھ کے آنسو نہیں سوکھے
مرے مالک سکون و صبر کا یہ امتحاں کب تک

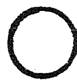
مجھے صادق یہی تو پوچھنا ہے اپنے حاکم سے
کہ دُہراتے رہو گے ظلم کی یہ داستاں کب تک



دو شعر

رنگیں ہے کائنات غزل کہہ رہا ہوں میں
آنکھوں میں ہے حیات غزل کہہ رہا ہوں میں

جس کی حسین ذات نے شاعر بنا دیا
اُس کا ہے التفات غزل کہہ رہا ہوں میں



نظریں اُٹھیں تو دید کے جذبے سنور گئے
آنسو نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں بھر گئے

مٹی میں تل رہی ہے جو اہلِ ہنر کی آبرو
کیا جانے کس زمین پہ اہلِ نظر گئے

پتھر تراشتے ہیں وہ ہیروں کے شہر میں
کاریگرانِ شہر کے جذبے بکھر گئے

اب اپنے شہر میں بھی درندوں کا راج ہے
کیا انقلاب ہو گیا انساں کدھر گئے

اُن کی کہانی رہ گئی تسکیں کے واسطے
تہذیبِ فکر و فن کے محافظ گذر گئے

بس کچھ کتابیں شلف پہ رکھی ہوئی ملیں
دفتر سے لوٹ کر جو کبھی اپنے گھر گئے

جو سایہ دار پیڑ تھے بستی کے واسطے
وہ لوگ خشک پتّوں کی صورت بکھر گئے

صادق وہ چند لوگ جو پیاسے کے ساتھ تھے
تاریخ ہے گواہ بڑا کام کر گئے



دو شعر

ماضی کی سرد گود میں جلتا ہے آدمی
دار و رسن کے سائے میں پلتا ہے آدمی

اپنی اَنا کی لاش لئے اپنی گود میں
خنجر کی تیز دھار پہ چلتا ہے آدمی



پیاس پانی کا دل بڑھاتی ہے

یوں سمندر کو موت آتی ہے

رات روشن ہے تیری یادوں سے

صبح ظلمت میں ڈوب جاتی ہے

ایک لمحے کی زندگی کے لئے

کتنی صدیوں کو موت آتی ہے

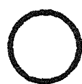
روز خوابوں کی فصل بوتا ہوں

روز برسات روٹھ جاتی ہے

ساری مستی شراب خانے کی

تیری آنکھوں میں ڈوب جاتی ہے

مسکراتا ہوں غم کی باہوں میں
ساری دنیا فریب کھاتی ہے
ایک بچے نے مجھ سے پوچھا تھا
کیا اجالوں کو موت آتی ہے
لوگ صادق کو یاد کرتے ہیں
جب صداقت کی بات آتی ہے



دو شعر

خاموش وقت رات کا چہرہ دھواں دھواں
ڈھلتے ہوئے شباب کی بے ربط داستاں
بہتی ہوئی شراب کا ٹوٹا ہوا غرور
ساقی کی چشم ناز میں بوتل کی ہچکیاں



یہ وقت آگ کا دریا ہے آسرا دینا
اگر میں جل بھی اٹھوں پھونک کر بجھا دینا

یہی ہے شرطِ وفا پتھروں کی بستی میں
لہو بہے بھی جو زخموں سے مسکرا دینا

یہ خنجروں کی سلگتی ہوئی زبانیں ہیں
انہیں نہ پھول کی پتی کا تم پتہ دینا

یہ میرے شہر کی ٹوٹی ہوئی فصیلیں ہیں
انہیں گرا کے نیا شہر اک بسا دینا

تمہارے گھر کا ہر اک فرد روٹھ جائیگا
ذرا سنبھل کے مرے حق میں فیصلہ دینا

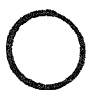
یہ ایک آگ کے دریا کا جلتا ساحل ہے
یہاں نہ موم کے جسموں کو آسرا دینا

میں خود ہی گہرے سمندر سے لوٹ آؤں گا
بس ایک بار مجھے پیار سے صدا دینا

ہمارے دور کے بچے بھی پوچھ لیتے ہیں
وفا کا پیار کا اخلاص کا پتہ دینا

یہ میرے گھر کی روایت کا پاس ہے صادقؔ
زبانِ زخم سے قاتل کو بھی دعا دینا





نظروں میں انقلاب کے تیور سما گئے

الفاظ خود سمٹ کے مرے پاس آ گئے

مفلس کی بیٹی گویہ غریباں کا اک چراغ

وہ کون تھے جو چپکے سے اس کو بجھا گئے

یہ درد میرے دل کی زمیں کا شجر تو ہے

وہ انقلابِ وقت کی نظروں میں آ گئے

وہ لوگ جن کے قدموں میں رقصاں بہار تھی

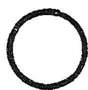
سو کچھ ببول میری زمیں پر اگا گئے

میں ریزہ ریزہ ٹوٹ کے بکھرا ہوں چارسو

وہ جب قدم مری محفل میں آ گئے

جب کبھی غزل کہی ہے تو محسوس یوں ہوا
وہ میرے پاس آ گئے دل میں سما گئے

صادق وفا کے نام سے جلتے ہیں وہ چراغ
تاریکیوں کے شہر کو جو جگمگا گئے



دو شعر

نگاہوں سے برسے ہیں آنسو کی صورت
مرے چاکِ داماں پہ پانی کے شعلے
یہ پتھر کے بازو یہ فولاد کے دل
سُلگتی ہوئی اک کہانی کے شعلے



اس دور میں تسکین کا ساماں نہیں ہے

جیتے ہیں مگر جینے کی پہچان نہیں ہے

ٹوٹے گا بہر حال اگر چوٹ لگے گی

مٹی کا کھلونا ہے یہ انسان نہیں ہے

جسموں پہ تقدس کے لبادوں کو نہ دیکھو

عالم وہ نہیں ہیں جنہیں ایمان نہیں ہے

ہم لوگ کھلے ذہن کھلے دل سے ملیں گے

آجایئے دروازے پہ دربان نہیں ہے

معصوم تبسّم نے یہ پوچھا تھا کسی دن

اس بھیڑ میں کیا کوئی بھی انسان نہیں ہے

انگلی سے جو ریتی پہ لکھا ہے وہی پڑھ لو

صادق ہے غریب آدمی دیوان نہیں ہے





گلا تہذیب کا کاٹا گیا ہے
یہ میرے شہر کا اک واقعہ ہے
ستارا ٹوٹ کر جب بھی گرا ہے
بچھڑنے کا سماں یاد آ گیا ہے
میں اس چھوٹے سے بچے کی طرح ہوں
جو ہر تتلی کے پیچھے بھاگتا ہے
مجھے اک بار پھر آواز دینا
یہ آوازوں کا جنگل گونجتا ہے
میں لاشوں کے سمندر میں کھڑا ہوں
زباں پر زندگی کا مرثیہ ہے

محبّت ایک لفظِ معتبر ہے

مری کاپی میں ایسا ہی لکھا ہے

وہ اک فنکار ہے نظروں کے آگے

جو صادق کی زباں میں بولتا ہے

○

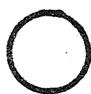
تین شعر

اُف وہ مہتاب سا چہرہ وہ چلن آوارہ

آنکھ شرمائی سی ماتھے پہ شکن آوارہ

اُن کے قدموں کے نشاں دیکھ کے چلتی ہے بہار

ایسا لگتا ہے کہ ہو جیسے چمن آوارہ



لہو کے دیپ روشن ہیں چمن میں

اُجالا ہے ہماری انجمن میں

خیالوں کا کفن بنتا ہے مصرع

لہو شامل نہ ہو گر فکر و فن میں

تھی عادت درد و غم میں مُسکرانا

روایت ہے یہ اب اہلِ دکن میں

یہ مصرع ایک افسانہ ہے شائد

"بہارِ بے خزاں آئی چمن میں"

نئے سورج تراشو فکر و فن کے

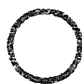
اندھیرا ہے بہت صحنِ چمن میں

ہر اک چہرے پہ یہ کس نے لکھا ہے
مسافر ہوں میں اپنے ہی وطن میں
یہی صادق ہماری داستاں ہے
ہمیشہ ہی رہے دار و رسن میں



تین شعر

جو انقلاب چھپائے ہیں سینوں میں
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں ان زمینوں میں
تمہارا روپ، تمہاری نظر، تمہارا بدن
تلاش کرتا ہوں مدت سے مہ جبینوں میں
تمہیں خبر نہیں صادق مگر یہ بات تو ہے
تمہارے نام کا چرچا ہے غم نصیبوں میں



محسوس یہ ہوتا ہے فلک بوس زمیں ہے
یوں آپ کی چوکھٹ پہ جھکی میری جبیں ہے

یہ ٹوٹ کے بہتے ہوئے لمحات کا دریا
میری ہی نگاہوں میں رُکے گا یہ یقیں ہے

پھولوں کو جو جلتے ہوئے صحرا میں اُگا دے
ایسا بھی کوئی شخص زمانے میں کہیں ہے

وہ ایک ہی چہرہ ہے جسے دیکھ کے اکثر
محسوس یہ ہوتا ہے یہ دنیا بھی حسین ہے

اے عظمتِ فردوس تصوّر تری نسبت
ہر دَور کی تقدیر ہے ہر دل کا یقیں ہے

ہر دل کے صحیفے پہ لکھا ہے یہی مصرعہ

"فردوسِ ادب" محفلِ اربابِ یقیں ہے

صادقؔ غم و آلام کے طوفاں میں رہا ہے

ہر دور کی تاریخ ہے یہ جھوٹ نہیں ہے



تین شعر

کون آتا ہے یہ جلتی سی چھاؤں کے قریب

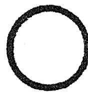
وقت کی دھوپ میں تپتی ہوئی یادوں کے قریب

کس نے پتھر کی جبینوں میں اُگائے سورج

کون آیا تھا یہ ویران چٹانوں کے قریب

جام ٹوٹے ہیں کسی دوست کے وعدے کی طرح

ساز خاموش ہیں بے آس اجالوں کے قریب



شہر ہے شہرِ وفا پر کوئی دستور نہیں
جس کو دعویٰ ہے قیادت کا وہ منصور نہیں

دیکھ سکتا ہوں اُسے اپنے ارادوں کے قریب
میری منزل مرے قدموں سے بہت دور نہیں

پیار، احساس، وفا، درد و الم اُن کی عطا
ترک کر دوں یہ امانت مجھے منظور نہیں

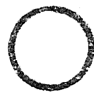
فکر آزاد، ارادے ہیں جواں، عزم بلند
قید خانے میں سہی پھر بھی میں مجبور نہیں

ظلمتیں میرا مقدر ہے ہر اک روز ہے شب
سلسلہ شب کا ہے لیکن شبِ دیجور نہیں

جب بھی چاہوں گا بدل دوں گا نظامِ ہستی
آپ مختار سہی میں بھی تو مجبور نہیں

میرے افسانہ کا عنواں مری حسرت کا نشاں
خون کی سرخی ہے اس مانگ میں سیندور نہیں

آپ صادق کو بہرحال وہاں بلوائیں
ظلمتیں ہوں جہاں محفل میں کوئی نور نہیں



ایک شعر

حیات یوں ترے قدموں پہ رقص کرتی ہے
کہ جیسے پھول کی پتی پہ قطرۂ شبنم

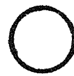


ایک سے چہرے ایک سے احوال
ایک ہی ہے ہر اک نظر میں سوال
اِس فسادوں کی جلتی بستی میں
کتنا جھوٹا ہے زندگی کا خیال
اے خلوص و وفا سہارا دے
اُن سے کہنا ہے درد کا احوال
چار تنکوں کو آشیاں کہہ کر
میں نے دیکھا ہے بجلیوں کا جلال
ڈھلتا سورج ہے روشنی کم ہے
اِس کو کہتے ہیں رفعتوں کا زوال

زندگی کی طویل راہوں پر
تم کہیں ہو کہیں تمہارا خیال

ہجر کی رات یوں گزاری ہے
ایک اک لمحہ ہو گیا اک سال

آپ صادق کو کیا سمجھتے ہیں
چڑھتے سورج کی ہے وہ ایک مثال



دو شعر

زندگانی کو نیا روپ دیا ہے میں نے
اپنے زخموں کو بھی کانٹوں سے سیا ہے میں نے

تم کو چاہا ہے بہت ٹوٹ کے چاہا ہے تمہیں
ہاں محبّت کا حسیں جرم کیا ہے میں نے



تصوّرات کی دنیا میں روشنی ہوتی
تمھارا ساتھ جو ملتا تو زندگی ہوتی

ہزار بادہ و ساغر ہیں سامنے لیکن
تمہاری آنکھ سے پیتا تو میکشی ہوتی

خیال لفظ کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا
تمھارا نام جو لکھتا تو شاعری ہوتی

گلوں سے خار کا رشتہ سمجھ میں آجاتا
ترے غرور میں شامل جو سادگی ہوتی

یہ چند لفظ ہیں صادق کی شاعری تو نہیں
سنبھل کے سوچ کے لکھتا تو شاعری ہوتی



بے نام سی ہے ایک تمنا بنی ہوئی

میری حیات بھی ہے تماشہ بنی ہوئی

میں خود ہی ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرا ہوں بار بار

پھر بھی ہے میری ذات معمّہ بنی ہوئی

آواز دے رہا تھا کوئی راہِ شوق سے

پلٹی مری حیات تمنا بنی ہوئی

نظروں میں اب تو کوئی بھی چہرہ نہیں رہا

آتی ہے تیری یاد ہی چہرہ بنی ہوئی

صادق کی شاعری بھی ہے خاموش احتجاج

لفظوں کے پیرہن میں تقاضہ بنی ہوئی



چمن برباد ہوگا پر سلامت آشیاں ہوگا
میں کہتا ہوں نہیں ہوگا وہ کہتے ہیں کہاں ہوگا

زمیں زرخیز ہے "فردوس" والوں کا عطیہ ہے
مجھے اس کا یقیں ہے محو حیرت آسماں ہوگا

لہو کا داغ آئے گا جبینِ شوق پر جس دن
وہ تہذیب و تمدن کی تباہی کا نشاں ہوگا

کبھی الفاظ بھی خنجر کی صورت زخم دیتے ہیں
جو گھائل ہوگا لفظوں سے وہ مقتولِ زباں ہوگا

مری آنکھوں میں دم ہوگا صدا نکلے گی مشکل سے
چلے آؤ چلے آؤ یہی وردِ زباں ہوگا

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ میرے پاس بیٹھے ہیں
مگر اس کا یقیں ہے وہم ہوگا یا گماں ہوگا

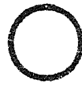
میں اُس لمحے کو اپنی زیست کا عنواں بنا لوں گا
نہ کوئی فاصلہ جب میرے تیرے درمیاں ہوگا

چمن میرا ہے میں نے پیار سے اس کو سنوارا ہے
اگر میری روش بدلے گی پھولوں کو گراں ہوگا

ہمارے شہر میں لاشوں کا تاجر جب بھی آئے گا
ہوا ہوں پہ برسے گا فضاؤں میں دھواں ہوگا

چلو تم جرم کرنا ہم سزا اُس کی بھگت لیں گے
مگر اک روز آئے گا کہ عادل درمیاں ہوگا

ابھی تو ذہن و دل کی کشمکش ہے راہِ ہستی پر
یہ عالم بیت جائے گا جو صادق پاسباں ہوگا



راستے پر نقشِ پا ہیں کارواں ملتا نہیں

رہبرانِ وقت میں اک مہرباں ملتا نہیں

یاد اتنا ہے کہ روشن ہو گیا تھا گلستاں

ڈھونڈھتا ہوں اب تو میرا آشیاں ملتا نہیں

میری بستی میں محبت کا عجب دستور ہے

دوست مِل جاتے ہیں لیکن رازداں ملتا نہیں

میری آنکھوں میں رہو یا میرے دل میں گھر کرو

کون کہتا ہے سلیقہ کا مکاں ملتا نہیں

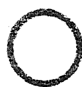
آبلہ پا، دھوپ، صحرا، تشنگی کے باوجود

ڈھونڈھتا پھرتا ہے لیکن کارواں ملتا نہیں

وائے بر تحطِ زبان علم و دانش، فکر و فن
معتبر کوئی بھی دانشور یہاں ملتا نہیں

اے زمانہ سازِ ہستی کُن کی پھر آواز دے
جس کو تو انسان کہتا ہے یہاں ملتا نہیں

محفلِ صورتگرانِ عشق میں ڈھونڈو اُسے
کون کہتا ہے کہ صادق کا نشاں ملتا نہیں

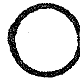


ایک شعر

چند پیسوں کیلئے جن کے قلم بکتے ہیں
تم کو مِل جائیں گے ہوٹل میں وہ فنکار بہت



رات آئی تری یادوں کا سمندر آیا
بند دروازہ سے ہوتا کوئی اندر آیا
یوں کبھی ہوتا ہے کڑی دھوپ میں چلتے چلتے
کوئی آواز لگاتا ہے قلندر آیا
دل کے دروازہ پہ صف بستہ کھڑے تھے جذبات
فاتحِ مملکتِ عشق سکندر آیا
اے سمندر کے خدا آج تو شبنم دیدے
جلتے صحرا کی تپش کھا کے قلندر آیا
وقت صادق ہے اسے روک کے پوچھو تو ذرا
کیسے اس شہر میں پیاسوں کا سمندر آیا



پتھر سے کر رہا ہوں جو اک گلبدن کی بات

دانشوری کی دین ہے دیوانہ پن کی بات

خاموش زندگی نے دیا ہے یہ حوصلہ

آنکھوں سے کر رہا ہوں تری انجمن کی بات

محفوظ ہے روایتِ کہنہ بنی ہوئی

تاریخ کی کتاب میں اہلِ دکھن کی بات

ہم نے فرازِ دار پہ کی حق کی گفتگو

ہم سے چلی ہے دہر میں دار و رسن کی بات

یا رب ترے ہی ہاتھ ہے اب آبروئے شعر

پتھر مزاج کرتے ہیں شعر و سخن کی بات

سورج کو پی لیا ہے اندھیروں کو اوڑھ کے
یوں ہو رہی ہے دوستو شعر و سخن کی بات

اک لفظ کُن ہے، جس کی ہے تفسیر میری ذات
دھرتی پہ کر رہا ہوں میں اپنے وطن کی بات

آنکھوں نے کی ہے دل نے سنا ہے خلوص سے
اس احتیاط سے ہوئی گُل پیرہن کی بات

صادق ہے جس کا نام اُسے جانتے ہیں لوگ
اِس دور میں بھی کرتا ہے وہ فکر و فن کی بات





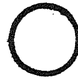
جانے کون کہاں تک جائے اِن راہوں پر چلتا ہے
شعلوں کی بارش میں دیکھیں کس کا دامن جلتا ہے

اپنوں کی سوغات سمجھ کر آنسو بھی پی لیتا ہوں
ورنہ میری آنکھ کا آنسو سورج بن کر ڈھلتا ہے

ساغر بن کر جن کی جوانی گردش کرتی رہتی ہے
اُن سے پوچھو کون سیہ راتوں میں کیونکر جلتا ہے

اُس کو ہم نے رہبر مانا اس کے پیچھے چلتے ہیں
جو شعلوں کی بارش کرتا بستی بستی جلتا ہے

چہروں کی اس بھیڑ میں شاید اُس کا کوئی دوست نہیں
رات کی باہوں میں جو صادقؔ غم کا مارا پلتا ہے



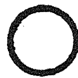
اتنا کافی ہے مجھے اپنی خوشی کے واسطے
انکی آنکھوں کا سہارا بیکسی کے واسطے

بیکسی، بیچارگی، درد و الم، خوفِ گناہ
کتنے مشکل مسئلے ہیں آدمی کے واسطے

اپنی آنکھوں میں جلایا ہے تبسّم کا چراغ
اُن کی محفل میں ذرا سی روشنی کے واسطے

ایک غنچے کے تبسّم نے بتایا ہے مجھے
ایک دو لمحے بہت ہیں زندگی کے واسطے

محترم ہے زندگی صادق کسی کی یاد میں
ورنہ کیا رکھا ہے دنیا میں کسی کے واسطے



پتھر کا پجاری کبھی آذر نہیں ہوتا

شیشہ کا جگر واقفِ جوہر نہیں ہوتا

وہ پیاس کا مارا ابھی یہی سوچ رہا ہے

اے کاش کہ قدموں میں سمندر نہیں ہوتا

وہ اشک جسے دامنِ رحمت نہیں ملتا

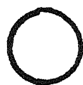
گوہر کی طرح ہوتا ہے گوہر نہیں ہوتا

آنکھوں کے دریچے سے چلے آیئے دل میں

ویران مکانوں میں کوئی در نہیں ہوتا

صادق تو سرِ دار بھی حق بات کہے گا

مٹی کا بشر نور کا پیکر نہیں ہوتا



وہ پاس رہتا ہے میرے مری نظر کی طرح
مگر میں دیکھ نہ پایا اُسے بشر کی طرح

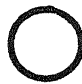
مرا شرف مری نسبت ہے، تیرے قدموں سے
میں محترم ہوں مگر تیرے سنگِ در کی طرح

سوال آپ پہ پتھر لگائے جاتے ہیں
یہ شہر بھی ہے شہیدوں کی رہگزر کی طرح

یزیدِ وقت سے پانی کا کیا سوال کریں
کھڑے ہوئے ہیں بڑی دیر سے شجر کی طرح

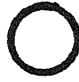
اُسی کے خشک لبوں پر ہے اعتبارِ حیات
کہ جس کا نام بھی ہے حرفِ معتبر کی طرح

صدف میں رہتا ہے گہرے سمندروں کے تلے
مرے خیال کا پیکر بھی ہے گہر کی طرح
یہ فکر و فن کا عجب انحطاط ہے صادق
کہ اب تو عیب بھی لگتا ہے اک ہنر کی طرح



دو شعر

بہرے ہیں زبانوں پہ قلم ٹوٹ گئے ہیں
اس دور کا دستور ہے فنکار کی زنجیر
حالات کے صحرا میں یہ پیاسوں کا سفر ہے
ہیں ہاتھ بندھے پاؤں میں افکار کی زنجیر



آئینہ میں بن گیا ہوں جب مجھے پتھر ملا

آپ کی نظروں میں آیا ہوں تو یہ جوہر ملا

سوکھے دریا کے کنارے سُو رہا ہوں ریت پر

بے در و دیوار کتنا خوبصورت گھر ملا

جب سلیقہ آگیا ہے لہجے پرکھنے کا مجھے

لفظ گہرے ہو گئے ہر لفظ میں دفتر ملا

رقص فرما موت تھی پھولوں کے نازک جسم پر

روشنی آنکھوں میں آئی جب تو یہ منظر ملا

یوں مکمل کی ہے اندازِ جنوں کی داستاں

پتھروں کے مول بیچا ہے اگر گوہر ملا

پیاس دریا کا مقدّر بن گئی تھی ایک دن

واقعہ یہ بھی مجھے تاریخ کے در پر ملا

مُسکرا کر جس نے اُلٹا تھا بساطِ ظلم کو

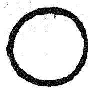
ایک ایسا بھی سپاہی بر سرِ محشر ملا

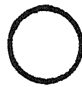
میرے آنسو بھی امانت ہیں اُسی کے دوستو

اس کے قدموں میں بچھا دوں گا اگر رہبر ملا

بخش دوں گا اپنی ساری فکر و فن کی کاوشیں

مجھ کو صادقؔ گر جہاں میں کوئی قدآور ملا





حکایتِ غمِ دوراں اسیرِ ذات ہوئی
ہماری زیست بھی صرفِ تغیّرات ہوئی

اُجالے بیچ کے ہم نے خرید لیں راتیں
میں سوچتا ہوں کہ کیسے یہ وارِدات ہوئی

وزیر زد پہ ہے اور بادشاہ بے بس ہے
تمہاری جیت ہوئی ہے نہ میری مات ہوئی

کوئی صدا اٹھی نہ آوازہ اور نہ سرگوشی
مگر یہ بات ہوئی ہے کہ اُن سے بات ہوئی

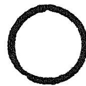
وہ ایک نام جسے کوئلے سے لکھا تھا
مٹا دیا ہے تو تاریک کائنات ہوئی

وہ میرا بھائی تھا زخموں کی دے گیا سوغات

وہ میرا گھر تھا جہاں ایسی واردات ہوئی

تمہارے دور میں صادق کا کام ہی کیا ہے

وہ سچ کہے گا اگر زندگی کی بات ہوئی



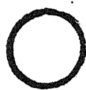
دو شعر

کھلونوں کی دکاں پر درد کے شہکار لایا ہوں

یہ کچھ آنسو ہیں جن کو بیچنے بازار آیا ہوں

جسے دنیا نے بڑھ کر زندگی کا نام دے ڈالا

اُسی بے ربط سی خواہش کا صادق میں ستایا ہوں



ستم کدہ میں ستمگر سے پانی مانگتے ہیں

عجیب لوگ ہیں پتھر سے پانی مانگتے ہیں

یہ میرے شہر کی تہذیب کا زوال تو ہے

جو جل رہا ہے اسی گھر سے پانی مانگتے ہیں

روایتوں کی حقیقت پہ شک کرے نہ کوئی

بس اتنی بات ہے، اس ڈر سے پانی مانگتے ہیں

ہم اپنے شہر کے حاکم سے کچھ نہیں کہتے

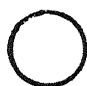
تڑپ تڑپ کے ستمگر سے پانی مانگتے ہیں

سوالِ آب پہ تیروں کا مینہہ برستا ہے

عظیم لوگ ہیں لشکر سے پانی مانگتے ہیں

ہمارا طرز تو صدیوں میں بھی نہیں بدلا
ہم اپنے ساقیٔ کوثر سے پانی مانگتے ہیں

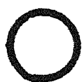
ہمارے شہر کا صادق عجیب عالم ہے
کہ اہلِ ظرف بھی گھر گھر سے پانی مانگتے ہیں



دو شعر

چہرے کے رنگ روپ سے نکھرا ہوا شباب
ساغر میں جیسے گھول دیا جائے آفتاب

دونوں نے مل کے ساتھ بجھائی ہے اپنی پیاس
میں اُس کو پی چکا ہوں مجھے پی چکی شراب



میری آنکھوں میں کسی نے تو یہ دیکھا ہوگا
بہتے پانی میں کسی شخص کا چہرہ ہوگا

جسکی آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی ہو
اُس کے ہونٹوں پہ تبسّم کا سلیقہ ہوگا

میں نے ریتی میں لگائے ہیں گلابوں کے شجر
پھول صحرا میں کھلیں گے تو تماشہ ہوگا

یہ روایت بھی حقیقت بھی ہے تاریخ بھی ہے
آستیں خون میں ڈوبے گی تو چرچا ہوگا

اپنے ماحول کی زہریلی فضاؤں کے طفیل
اب تو پھولوں پہ بھی شبنم کو برکھا ہوگا

کتنی صدیوں سے یہی بات وہ دہراتے ہیں

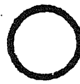
رات گذرے گی تو ہر سمت اُجالا ہوگا

ہم تو اُس شخص کے سایہ میں بسر کرتے ہیں

جس کا سایہ نہ فلک نے کبھی دیکھا ہوگا

جن کتابوں میں لکھی ہے ترے صادق کی حیات

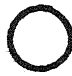
اُن کتابوں پہ ترا نام بھی لکھا ہوگا



ایک شعر

تاریخ کے ہر دور نے دہرایا ہے اُن کو

غم جو مرے نام سے منسوب ہوئے ہیں



خود کاشتہ فساد کا احوال دیکھئے
ٹوٹے ہے کائنات مرا حال دیکھئے

میں ریزہ ریزہ ہو کے فضاؤں میں بٹ گیا
اب آرہے ہیں وہ مرے اعمال دیکھئے

میں خود کو چھوڑ آیا سمندر کی گود میں
طوفان کی زندگی کے مہ و سال دیکھئے

تصویر تیری میز پہ رکھی رہی مگر
برسوں لگے ہیں تیرے خدوخال دیکھئے

تقسیم کر رہا ہوں میں اپنی متاعِ فکر
نسلاً فقیر زادوں کو خوشحال دیکھئے

صادقؔ فقیہہِ شہر کو آئینہ دیجیئے
اپنی نظر سے اپنے ہی اعمال دیکھئے





تیرے لہجے کا ترنم بھی ہے جھنکار بھی ہے

زندگی پیار بھی ہے درد کا اظہار بھی ہے

میں تو انجان مسافر ہوں چلا جاؤں گا

تیری محفل سے الگ سایۂ دیوار بھی ہے

میں نے اپنے کو کتابوں میں چھپا رکھا ہے

لفظ میرے لئے سایہ بھی ہے تلوار بھی ہے

وہ تو اخبار کی سرخی ہے اسے پڑھ لینا

سنسنی خیز سہی لائقِ اظہار بھی ہے

کتنی لاشوں نے یہ پوچھا ہے کہ بستی والو

سب ہیں معصوم یہاں کوئی گنہگار بھی ہے

کتنا آسان ہے صادق کا تعارف سن لو

ایک سادہ سا مسلمان بھی فنکار بھی ہے





تاریخِ میکشی کی مکمّل کتاب ہے

وہ آدمی نہیں ہے پرانی شراب ہے

خود میں نے اپنے دل کو سمندر بنا لیا

اب زندگی نہیں ہے فقط اضطراب ہے

دروازہ کھٹکھٹا نا رہا کوئی رات بھر

میں سوچتا رہا یہ حقیقت ہے خواب ہے

کتنی کہاں سے کیسے میسّر ہوئی شراب

یہ سب ہی جانتے ہیں مرا کیا جواب ہے

نغمے لٹا رہا ہوں میں بھوکوں کے شہر میں

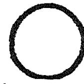
والشورانِ قوم بڑا انقلاب ہے

سوکھے ہوئے ببول کے سائے میں بیٹھ کر
یہ سوچتا ہوں کونسا کانٹا گلاب ہے
صادقؔ زمینِ شعر پہ سبزہ اُگائیے
وہ دیکھتے ہیں جن کی نظر آفتاب ہے



تین شعر

رُخ بدل دے بھی اگر وقت کا بہتا دریا
تم چٹانوں کی طرح راہ گزاروں میں رہو
گُل کے دامن پہ گرو قطرۂ شبنم بن کر
مسکراتے ہوئے گلشن کی بہاروں میں رہو
ایک ہی بار سہی ٹوٹ کے صادقؔ سے ملو
اس کی محفل میں چلو درد کے ماروں سے ملو



پھر کتابِ زیست پر میرا یہ افسانہ لکھو
زخم رستے ہیں مگر خوش ہے یہ دیوانہ لکھو

خون پیتے ہیں مگر تشنہ لبی جاتی نہیں
رات کی بانہوں میں ہے اب تک یہ میخانہ لکھو

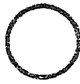
ہم جہاں کانٹوں پہ چلتے تھے گلوں کی چاہ میں
یاد آتا ہے ابھی تک بھی وہ ویرانہ لکھو

اے فسانہ سازِ ہستی میکدے کی آبرو
نام کا تیرے اٹھا رکھا ہے پیمانہ لکھو

میں نے رکھ دی ہے تمہارے سامنے کُل کائنات
تم فقیہہ شہر ہو جنّت کا پروانہ لکھو

دیکھنے والوں کی نظروں میں وفا سرنار ہے
شمع جب تک بھی جلے جلتا ہے پروانہ لکھو

اب تو اس کے نام کا چرچا ہے سارے شہر میں
تیرا صادق ہو گیا ہے وقفِ میخانہ لکھو



رات سہمے ہوئے لہجے میں کہانی کہنا

دن نکل آئے تو آنکھوں کی زبانی کہنا

اُن کی دیوار پہ لکھ دینا نہیں آسکتا

اور سرِ شام جو آنا تو جوانی کہنا

آکے رک جائے جو پلکوں پہ تو کہنا آنسو

ٹوٹ کر برسے جو آنکھوں سے تو پانی کہنا

ہم تو پیشانی کی تحریر پڑھا کرتے ہیں

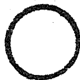
ہم سے چہروں کی نہ خاموش بیانی کہنا

اپنے زخموں کی دکاں خوب سجا کر رکھنا

پوچھ بیٹھے جو خریدار کہانی کہنا

نقشِ صادق کا بنانا کسی کا عادت نہیں

جھوٹ کہنا ہو اگر یوسفِ ثانی کہنا





اس نے پوچھا تھا محبت بھی کہیں ملتی ہے
میں نے آہستہ کہا ہاں وہ یہیں ملتی ہے

تیری تصویر لئے پھرتا ہوں بستی بستی
کوئی صورت تری صورت سے نہیں ملتی ہے

مسکراتا ہے کوئی دار کے سائے میں کھڑا
موت احساس کے جادہ پہ حسیں ملتی ہے

پھول پتھر پہ کھلے خواب میں دیکھا تھا کبھی
ڈھونڈتا پھرتا ہوں تعبیر نہیں ملتی ہے

اب تو تو نے بھی ہمالہ کا لقب پاتے ہیں
اب قد آور کو کہاں کوئی زمیں ملتی ہے

وہ تو چہرے کو بدل لیتا ہے ماحول کے ساتھ

اُس کے چہرے پہ صداقت ہی نہیں ملتی ہے

شعر اب ذہن سے کاغذ پہ کہاں آئیں گے

لفظ ملتے ہیں نہ شاداب زمیں ملتی ہے

تم نے دیکھا نہیں صادق کو طرحداروں میں

ایسے رہتا ہے کہ تشبیہ نہیں ملتی ہے



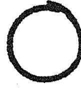
دو شعر

ایک دو گام پہ منزل تھی مگر کیا کیجے

ہم ہی پھرتے رہے آوارہ خیالوں کی طرح

کتنی تنہائی ہے زخموں کے گھنے جنگل میں

کتنا خاموش ہوں مندر کے خداؤں کی طرح



ایک شعلہ جو بھڑکتا ہے گلستاں کے قریب
میرا آباد وہ گھر تھا کبھی ایواں کے قریب

ہم تو مٹی کے مکانوں میں بسر کرتے ہیں
مسکراتے ہوئے طوفان پہ طوفاں کے قریب

ایک بے آس جوانی کی کہانی کتنی
ایک بجھتا ہوا دیپک ہے غمِ جاں کے قریب

ہم جہانگیر ہیں انصاف کریں گے اُن سے
بات جب حق کی چھڑے گی دَرِ زنداں کے قریب

تم کو معلوم ہی کیا بھوک کسے کہتے ہیں
آدمی لوٹ کے آ جاتا ہے حیواں کے قریب

ایک ہی تو رہے صادقؔ کا سہارا ہمدم
فکرِ انساں سے پرے محفلِ یزداں کے قریب





معصوم لغزشوں کو خطا کہہ دیا گیا
دل کی ہر اک صدا کو دعا کہہ دیا گیا

چہرے کے رنگ و نور پہ پیاسی رہی نگاہ
بے نام سی خلش کو دعا کہہ دیا گیا

کتنے بدن جلے ہیں اندھیروں کی گود میں
کتنوں کی زندگی کو فنا کہہ دیا گیا

دیوانگیٔ شوق کا معیار دیکھیے
ہر اک حسین بت کو خدا کہہ دیا گیا

حق آندھیوں کی زد پہ سنایا گیا ہے جب
ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا کہہ دیا گیا



فکر و خیال و خواب کی بانہوں میں بانٹ دوں
لفظوں کو فکر و فن کے اجالوں میں بانٹ دوں

دہلیز پر کھڑے ہیں امیدوں کے قافلے
جی چاہتا ہے درد کے ماروں میں بانٹ دوں

جلتا ہوا چراغ ہوں طوفاں کی گود میں
اس مختصر حیات کو تاروں میں بانٹ دوں

شعلے سمیٹ لایا ہوں صحرا کی دھوپ سے
یخ بستہ وادیوں کی فضاؤں میں بانٹ دوں

تیرے گناہ اپنے مقدر میں ٹانک لوں
آ تجھ کو زندگی کے اجالوں میں بانٹ دوں

صادقؔ تصورات کے خورشید کی ضیا
اِن شب کے شاہزادوں کی راہوں میں بانٹ دوں





پتھر کو رنگ و روپ کا پیکر دیا گیا
دوشیزۂ حیات کو خنجر دیا گیا

مخمل کے فرش پر بھی تھے کانٹے ببول کے
بزمِ سرور و رقص کو جوہر دیا گیا

پینے کی آرزو تھی بہا دی گئی شراب
لرزاں تھے ہاتھ ہاتھ میں ساغر دیا گیا

تاریک آسماں کے تلے کٹ گئی حیات
بستر کے نام پر مجھے پتھر دیا گیا

کیچڑ کے پھول کوڑے کے کالر تک آ گئے
پستی کو آسماں کا مقدر دیا گیا

اپنے لہو سے اس نے جلایا چراغ کو
صادقؔ کو جب بھی رات کا منظر دیا گیا





تمہارے شہر میں جلتی ہے زندگی تنہا
مرے خیال کی بکھری ہے روشنی تنہا

میں میکدے سے چلا میکدے میں آ پہنچا
مری حیات کا مقصد ہے بے خودی تنہا

تصورات کے الجھے ہوئے مسائل سے
قرارِ عشق ہے احساسِ شاعری تنہا

میں ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرا ہوں تیری دنیا میں
خدائے وقت! گزاری ہے زندگی تنہا

یہ عکس عکس بکھرتے ہوئے بدن شاید
مرے خیال کی خوشبو ہیں بے کلی تنہا

یہ لوگ حضرتِ صادق کا نام لیتے ہیں
جہاں بھی ملتی ہے لفظوں کی روشنی تنہا





طوفاں کی سرد گود میں ہے ساحلِ حیات
اے ناخدائے وقت دکھا منزلِ حیات

کچھ اور بھی بڑھا دے جفاؤں کا سلسلہ
آساں ہو نہ جائے کہیں مشکلِ حیات

رستے ہوئے لہو کا فسانہ ہے زندگی
خنجر کی تیز دھار ہے ہر منزلِ حیات

آنسو ہیں درد و غم ہے تمنّا ہے میرے پاس
کیا مانگتا ہے مانگ لے اے سائلِ حیات

یہ جان کر بھی پیتا رہا ہوں تمام عمر
یہ قاتلِ حیات ہے یہ قاتلِ حیات

صادق صداقتوں کے اجالے کی بات ہے
یہ کاروانِ عشق ہے یہ محفلِ حیات





لکھتا ہوں ترا نام مرے نام سے پہلے
آغاز سنور جاتا ہے انجام سے پہلے

لیتا ہے کوئی جائزہ اعمال کا میرے
یہ سوچ لیا کرتا ہوں ہر کام سے پہلے

آنکھوں سے پلا دیتا ہے کوئی سرِ محفل
مدہوش میں رہتا ہوں بہت جام سے پہلے

میں بھی تو ذرا صبر کی معراج تک آؤں
غم اور بڑھا دیجئے آرام سے پہلے

لفظوں سے بھڑک اٹھتے ہیں جذبات کے شعلے
یہ سوچ سمجھ لیجئے دشنام سے پہلے

تنہائی ہے احساس ہے یادوں کا سمندر

بن باس کہے کیا پوچھ لو یہ رام سے پہلے

منزل کو ذرا دور ذرا دور ہٹا دو

ہر روز یہی کہتا ہوں ہر گام سے پہلے

احسان جتاتے ہیں وہ آ کر سرِ محفل

یوں زخم دیئے جاتے ہیں انعام سے پہلے

وہ ایک ہی تھا ایک ہی ہے ایک رہے گا

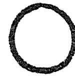
دی ضبط کی طاقت جسے صمصام سے پہلے

وہ ایک درخت آج بھی موجود ہے جس پر

لکھا ہے ترا نام مرے نام سے پہلے

صادق یہ صداقت کا تقاضہ ہے تو کہہ دو

خیام سے آ گے تھا میں خیام سے پہلے



اپنی غزلوں کو طرح دار بناؤں کیسے
بات کانٹوں کی ہے پھولوں سے سجاؤں کیسے

اب تو الفاظ بھی جلتے ہیں چتاؤں کی طرح
گیت لکھوں بھی تو محفل میں سناؤں کیسے

میرے زخموں کی صدا کون سنے گا یارو
کون قاتل ہے بتاؤں تو بتاؤں کیسے

اپنے اسلاف کی تہذیب کا جو قاتل ہے
اُس کو القاب سے عزت سے بلاؤں کیسے

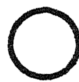
کتنے سورج ہیں جو جسموں کی کڑی قید میں ہیں
جانتا ہوں میں مگر تم کو بتاؤں کیسے

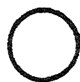
کون ہے سطوتِ شاہی کے طرحداروں میں
رازِ تاریخ کا دنیا کو بتاؤں کیسے

یہ بھی بتلائیں مجھے اہلِ محبت کے نقیب
بھوک کے بچوں کو میں مٹی پہ سلاؤں کیسے

بھوک تہذیب کے اقدار مٹا دیتی ہے
اہلِ دانش سے حقیقت یہ چھپاؤں کیسے

ذات کی قید میں صادق ہے تمنا کا وجود
سوچتا ہوں اُسے سولی پہ چڑھاؤں کیسے





تیری زمیں کا کوئی طرحدار چاہیئے
میں بُت تراشتا ہوں پرستار چاہیئے

ہاتھوں میں آکے ٹوٹ گیا پھول کا بدن
شکوہ زبانِ گل پہ ہے گلزار چاہیئے

مٹی کے ان گھروندوں میں رہتے ہیں کج کلاہ
دربار کا ترے کوئی فنکار چاہیئے

یہ موم کے بدن ہیں قیامت کی دھوپ میں
اے کردگار سایۂ دیوار چاہیئے

اب تو زبانِ خشک پہ کانٹے بھی پڑ گئے
بس ایک جام اے مرے سرکار چاہیئے

ٹیڑھی زمیں پہ پھر سے بنانا ہے ایک تاج
اخبار میں یہ دیدو کہ معمار چاہیئے

صادق زباں کو روک دے کس کی مجال ہے
حق آگہی کی بات سرِ دار چاہیئے



انسان وہ کبھی صاحبِ توقیر چاہیے
یہ خواب ہے تو خواب کی تعبیر چاہیے

آوارگانِ شوق بھٹکتے ہیں راہ پر
پھر اعتبارِ عشق کی زنجیر چاہیے

اٹھّے کے بعد پھر یہ کسی نے نہیں کہا
پیغمبرِ حیات کی تصویر چاہیے

لفظوں کی بارگاہ میں ہے سرنگوں خرد
پھر سے ترے کلام کی تفسیر چاہیے

یہ مرحلہ ہے دل کا نظر تو اٹھائیے
میں جانتا ہوں آپ کو دلگیر چاہیے

جب وہ عطا کرے جسے کہتے ہیں کردگار

تدبیر چاہیئے نہ تو تقدیر چاہیئے

اے خسروِ حیات تمنائے کائنات

اب آبھی جا کہ نور کی تنویر چاہیئے

صادق فقیہہِ شہر سے کہہ دیجئے ذرا

تقریر آپ کر چکے تحریر چاہیئے



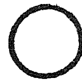
دو شعر

گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں رہے ہیں

وابستۂ حالات رہے میر بھی ہم بھی

طوفان کی گودی میں بھی صادق ہی رہے ہیں

فنکار کے جذبات رہے میر بھی ہم بھی



جن کے چہروں پہ لکھا ہے کہ سنوارا جائے
اُن کو کس نام سے بستی میں پکارا جائے

ٹوٹتی ریت کی دیوار ہے انساں کا وجود
دھوپ ڈھل جائے تو اس کا بھی سہارا جائے

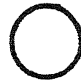
پھر بڑی دُور سے آتے ہیں لہو کے تاجر
پھر ذرا اپنی دکانوں کو سجایا جائے

ہم تو طوفان کی گودی میں سکوں پاتے ہیں
پاس آئے یا بڑی دُور کنارا جائے

جس کے آتے ہی تمناؤں کا ساگر سوکھے
اپنی بستی سے وہ حیوان خدارا جائے

شعر سوکھے ہوئے پتوں کی طرح لگتے ہیں
خون دے کر انہیں اے دوست نکھارا جائے

جس گھڑی صدق و صداقت پہ کوئی آنچ آئے
اُس گھڑی بزم میں صادق کو پکارا جائے



راہ محدود نہیں اُن کے شبستانوں تک
ہم ہی بڑھ جاتے ہیں احساس کے زندانوں تک

اعتبار آپ کی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
میں پہنچ جاتا ہوں تاریخ کے افسانوں تک

سرحدِ علم و یقیں تک نہیں پہنچی دنیا
ہیں ابھی وہم و گماں علم کے ایوانوں تک

شاعری فکر سے مربوط ہے ورنہ تو نہیں
بس یہی لکھا ہے قرطاس سے دیوانوں تک

عشق کی آگ سے ذہنوں کو جلا دیتے ہیں
بات آتی ہے کبھی جب ترے دیوانوں تک

پڑھ کے تاریخ کو دیکھو تو سمجھ میں آئے

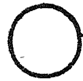
ہے حقائق کی رسائی بھی تو افسانوں تک

"رات گذری کہ گذاری ہے مجھے یاد نہیں"

صبح لے آئی ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں تک

میں بھی صادق ہوں صداقت کا بھرم رکھوں گا

بات پہنچے گی اگر تیرے ثنا خوانوں تک



دو شعر

تہذیب تھی یہ شہر کی حیرت ہے کس لئے

پتھر کا در بھی پھول کی پتی سے وا ہوا

یہ ٹھیک ہے کہ زر ہے زمیں اور نہ اقتدار

لیکن میں پوچھتا ہوں شرافت کو کیا ہوا



جب درد ابھرتا ہے خمِ خانۂ محشر میں
شعلے سے بھڑکتے ہیں چھلکے ہوئے ساغر میں

خاموش نگاہوں سے یوں پیار چھلکتا ہے
تصویر کوئی ابھرے جیسے کسی پتھر میں

آواز نہ دو آکر چوکھٹ پہ مرے دل کی
کوئی بھی نہیں رہتا ویرانے اس گھر میں

تاریخ لکھوں کیسے اس دورِ سیاست کی
راتوں کا اندھیرا ہے ہر صبح کے منظر میں

ہم لوگ تو پھولوں میں کانٹوں کا مقدّر ہیں
یہ درد بھی لکھ دیجے احساس کے دفتر میں

بیدار دماغوں کی اللہ رے مجبوری
باقی نہیں پی سکتے رہتے ہیں سمندر میں

صادقؔ مرے جادے کی پہچان نمایاں ہے
تقریر کے لہجے میں اشعار کے پیکر میں



پھول کیسے مہکیں گے کون شادماں ہوگا
پتھروں کی بستی میں کیسے گلستاں ہوگا

ہر زبان میں جس کے درس کا بیاں ہوگا
وہ مجاہدِ اکبر خود ہی بے زباں ہوگا

سُن رہا ہوں محفل میں پھر وہ آنے والے ہیں
پھر مری محبت کا آج امتحاں ہوگا

یہ اگر ہے آزادی قید کس کو کہتے ہیں
جب چمن ہی ویراں ہو کیسے آشیاں ہوگا

اور چار صدیوں تک بزمِ علم و حکمت میں
میری فکر کا عنواں زیبِ داستاں ہوگا

آپ ہی کے قدموں میں ہے بہار گلشن کی
آپ جس جگہ چاہیں گلستاں وہاں ہوگا

جس کا نام صادق ہے اُس کو کیا بتاتے ہو
دار کی بلندی پر اُس کا امتحاں ہوگا۔



وعدۂ رحمتِ عالم ہے گنہگار کے ساتھ
میرے احساس کا رشتہ ہے مرے پیار کے ساتھ

شعر خورشید کے مانند ضیا دیتے ہیں
جذبۂ شوق بھی شامل ہو جو اشعار کے ساتھ

چاندنی رات میں وہ پہلی ملاقات کی یاد
تیرے آمن کا سہارا تری دیوار کے ساتھ

آستینوں پہ ابھی خون کے دھبے کم ہیں
قتل کیجے گا مری ذات کو افکار کے ساتھ

اُس کی ہر بات ادا بھی ہے اداکاری بھی
کب تلک اپنی نبھے گی بھلا فنکار کے ساتھ

رات چپکے سے تصوّر میں جو آتا ہے کوئی

چونک اٹھتا ہوں میں پازیب کی جھنکار کے ساتھ

دار پہ، بزمِ جفا کار میں زندانوں میں

نام میرا بھی چلا آتا ہے ادوار کے ساتھ

یہ حقیقت بھی ہے تاریخ بھی تہذیب بھی ہے

رشتہ صادقؔ کا پرانا ہے بہت دار کے ساتھ



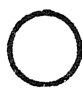
دو شعر

میری عبادتوں کو سلیقہ عطا ہوا

نظروں سے ایک پھر ترا سجدہ ادا ہوا

طاقت نہیں کلام کی کیسے دعا کروں

جو کچھ بھی تجھ سے پایا تھا صرفِ دعا ہوا



سب فرشتے ہیں گنہگار بشر کوئی نہیں
سب کو دعویٰ ہے مگر اہلِ نظر کوئی نہیں

صرف الفاظ ہی بازار میں بِک جاتے ہیں
فکر کا فن کا طلبگار مگر کوئی نہیں

سادگی تیرا کرم ہے کہ تری محفل میں
مطمئن سب ہیں مگر صاحبِ زر کوئی نہیں

مجھ کو بہتے ہوئے دریا کی کہانی نہ سمجھ
کشتیِ عمرِ رواں لوحِ نظر کوئی نہیں

شام کی زد پہ ہیں محصور اجالوں کے سفیر
شب کے دربار میں اے دوست سحر کوئی نہیں

بستی اپنی ہے نگر اپنا ہے احباب اپنے
پھر بھی فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہیں کہ گھر کوئی نہیں

نام صادق کا وہ لیتے ہوئے گھبراتے ہیں
جن کی دنیا میں صداقت کا نگر کوئی نہیں

تاریخِ حیدرآباد

پیار، اخلاص، وفا، عزم، تمنائے حیات
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

اسکی بنیاد ہی الفت کا چلن ٹھہری تھی
اس کے ذرّوں کو سکھایا گیا آئینِ وفا
اسکی باہوں میں بنے علم و عمل کے سانچے
اسکی گلیوں میں سنایا گیا آئینِ وفا
دل پہ شاہوں نے محبت سے حکومت کی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

یہ عمارات، یہ سڑکیں، یہ حسیں باغیچے
یہ مساجد، یہ منادر، یہ بزرگوں کے مزار
اینٹ مٹی سے بنائے یہ تقدس کے مکاں
پیار کے عشق کے معابد یہ تمدن کے وقار

ان کی دہلیز پہ شاہوں نے وفا مانگی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

کوئی مانے کہ نہ مانے یہ حقیقت ہے یہی
تخت کے تاج کے وارث نے قسم کھائی تھی
رودِ موسیٰ کو محبّت کا نگر کر دوں گا
اپنی دھرتی پہ اُسی دن تو بہار آئی تھی
زندگانی کے لبوں پر بھی ہنسی آئی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

پھر ہوا یوں کہ زمیں رشکِ جناں کہلائی
چار مینار بنا اپنی بلندی کا نشاں
چار سُو چار کمانوں نے سنوارا اس کو
حسن کی گودی میں پلا اور بڑھا عزم جواں
حُسن کو عشق نے جینے کی ادا بخشی تھی
حیدرآباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

اے قطب شاہ تری ہستی تری قوت کو سلام
حیدر آباد کے بانی تری عظمت کو سلام
تیری انسان سے بے لوث محبت کو سلام
عشق صادق تھا ترا تیری صداقت کو سلام

چار صدیوں سے محبت کی پذیرائی ہے
حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

آج بھی وقت ہے آؤ یہ ارادہ کر لیں
اپنی دھرتی پہ نہ لاشوں کی تجارت ہوگی
خون مظلوم کا ہوگا نہ شقاوت ہوگی
گھر جلیں گے نہ مذاہب کی تجارت ہوگی
اپنی تاریخ محبت تھی محبت ہو گی



رات خواب دیکھا تھا

رات خواب دیکھا تھا

آگ کے سمندر میں تیرتی ہوئی کشتی

اک مسافر تنہا

زندگی کی چاہت میں

آگ کے لپیٹوں کو

پھونک کر بجھاتا تھا

رات خواب دیکھا تھا

ریگِ گرم صحرا پر

کوئی ہل چلاتا تھا

اپنے خواب بوتا تھا

کاٹنے کو تعبیریں

رات خواب دیکھا تھا

ایک جسم پر جانے
کتنے چہرے چسپاں تھے
ایک جھوٹ کا چہرا
ایک چہرے قاتل

رات خواب دیکھا تھا

علم کے جزیرے میں
جہل کے گھروندے تھے
ان میں بسنے والے ہی
عالموں کے ان داتا صاحبانِ عظمت تھے
رات خواب دیکھا تھا



خزاں رسیدہ کلی

وہ اک معصوم لڑکی
قلم ہاتھوں میں آنکھوں میں حیا تھی
توجہ سے مرے اشعار سُن کر
اُنہیں کاپی میں لکھتی جا رہی تھی
غزل پڑھتے ہوئے میں سوچتا تھا
کہ جانے اس کے دل میں کونسا غم ہے
غمِ جاناں غمِ دوراں غمِ بربادیٔ انساں
اُسے اس کمسنی میں کیا ہوا ہوگا
مگر میں جس جہاں میں سانس لیتا ہوں
وہاں ایسا بھی ہوتا ہے
کلی کھلنے سے پہلے ہی خزاں کی نذر ہوتی ہے

○

دریچے ذہن کے کھولو

دریچے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے

جس کے لاشے پر کھڑے ہو کر

تم اپنے قد کو اونچا کر رہے ہو



دریچے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے

جس کے زخموں کا لہو لے کر

تم اپنے ہاتھ رنگیں کر رہے ہو



دریچے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو
کہ وہ بھی آدمی ہے
جس کے مٹی کے گھروندے کو جلا کر
تم اپنی راہ روشن کر رہے ہو



دریچے ذہن کے کھولو
ذرا سوچو
کہ وہ بھی آدمی ہے
کلب میں جس کی بیٹی ناچتی ہے
کہ بوڑھے باپ کو روٹی کھلائے



دریچے ذہن کے کھولو
ذرا سوچو
کہ وہ بھی آدمی ہے
جو اپنا پیٹ بھرنے کو تمہیں بھگوان کہتا ہے
غریبی ایک لعنت ہے



بے نام وجود

اُسے کس نام سے آواز دوں

جو میرے جسم کے اندر

کہیں پر چھپ گیا ہے

کبھی تنہائی میں چپکے سے آکر

جو میری بند آنکھوں کے دریچوں سے مجھے آواز دیتا ہے

مرے ہاتھوں میں ٹوٹا اک قلم دے کر

مجھے شاعر بناتا ہے



تضاد

میں ذرّوں میں بکھرتا جا رہا ہوں

اندھیرے کی فصیلوں پر کھڑا ہوں

مری آنکھوں میں بینائی نہیں ہے

زباں رکھتا ہوں گویائی نہیں ہے

میں صدیوں سے بس اتنا جانتا ہوں

میں زندہ ہوں مگر زندہ نہیں ہوں



میں اور پرندہ

پرندہ مجھ سے بہتر ہے
کم از کم اُس کی اپنی اک زباں ہے
اُسے اپنی زباں میں بولنے گانے کی آزادی تو حاصل ہے
مگر میری زباں پر
حکومت کا، سیاسی مصلحت کا
سماج اور اس کے اقداروں کا اک پہرہ لگا ہے
میں جب بھی بولتا ہوں گیت گاتا ہوں
تو یوں محسوس ہوتا ہے
کہ میری گفتگو، ہر ایک نغمہ
مرا اپنا نہیں وحشت زدہ ہے

ترسیل

کبھی اظہار کو الفاظ کی حاجت نہیں ہوتی
زباں خاموش رہتی ہے
کوئی آہٹ کوئی آواز کانوں میں نہیں آتی
مگر اظہار ہوتا ہے
کبھی نیچی نظر سے
کبھی چہرے کی رنگت سے
کبھی ہاتھوں کی جنبش سے
کبھی پیشانی کے بل سے



یہی اظہار کا واحد طریقہ ہے
جو ملکوں کی سرحد، لہجوں کے بیّن فرق
اور بکھری زبانوں کے کوئی جھگڑے سے آلودہ نہیں ہوتا

بیوہ تہذیب

مرا یہ شہر کتنا پُرسکوں تھا

یہاں کی ہر گلی اک مدرسہ تھی

جہاں تہذیبِ فکر و فن کے دھارے

سکونِ قلب فکرِ معتبر تقسیم کرتے تھے

مگر اک روز جانے کس گلی سے

لہو کا ایک سوداگر نکل آیا

لہو بکنے لگا، بہنے لگا

مری تہذیب بیوہ کی طرح اب

گلی کی موڑ پر تنہا کھڑی ہے



خوابِ صادق

یہ شیشے کے مکانوں میں
پگھلتے موم کے پُتلے
نہ جانے کیوں سحر کی آرزو میں اتنے حیراں ہیں
سحر ہو گی تو سورج کی تمازت سے
یہ ان کے کھوکھلے پگھلے ہوئے پیکر
فنا ہو جائیں گے اپنی بقا کی آرزو لے کر
پھر اس دھرتی سے اٹھیں گے
وہ انساں جن کے پیکر پتھروں سے سخت تر ہوں گے
جو سورج کی تپش کو اپنے اندر جذب کر لیں گے



آوازوں کا صحرا

میں آوازوں کے صحرا میں

خموشی ڈھونڈتا ہوں

مگر محسوس یوں ہوتا ہے جیسے

یہاں کا ذرّہ ذرہ چیختا ہے

یہ بے ہنگام آوازیں

سماعت کو مری مجروح کرتی جا رہی ہیں

مجھے اس کا یقیں ہے

کہ وہ دن آرہا ہے

کہ میں اپنی سماعت سے ہمیشہ کے لئے محروم

اسی صحرا میں آوارہ پھروں گا

حقیقت

کوئی جب بھی تعریف کرتا ہے میری

یہی سوچتا ہوں

مرے پاس کچھ بھی تو اپنا نہیں ہے

یہ دل ہے تو ہے یہ کسی کی امانت

یہ آنکھیں کسی کی عطا ہیں

یہ فکر و بصیرت کی دولت یہ ذہنِ رسا

یہ میری وفا کا صلہ ہیں

مرے پاس میرا تو کچھ بھی نہیں ہے



آئینہ سچ بولتا ہے

آئینہ سچ بولتا ہے

اسے توڑ ڈالو تو ہوگا بھی کیا

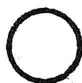
وہ دھبے تمہارے جو چہرہ کا حصّہ بنے ہیں

وہ کیسے ہٹیں گے

قصور اس میں اپنا تمہارا ہے ہمدم

تو پھر آئینہ کو اگر توڑ بھی دو

زمانے کی نظروں کو کیسے جدا کر سکو گے



نسبت کا شرف

مجھے نقوی کہتا ہے زمانہ

میں نسبت سے پکارا جا رہا ہوں

مری نسبت مری پہچان بھی ہے

آن بھی ہے

میں نسبت کے سہارے بڑھ رہا ہوں

مری نسبت مرا ایمان بھی ہے

شان بھی ہے

میں نسبت کے سہارے جی رہا ہوں

مری نسبت مرا ایمان بھی ہے

جان بھی ہے

قطعۂ تاریخ

ڈاکٹر صادق نے بھی اربابِ دنیا کیلئے
کتنے علم و فن کی راہوں میں جلائے ہیں دیئے
میں نے سالِ طبعِ حامیؔ عیسوی میں کہہ دیا
آگئے چھپ کر بفضلِ رب یہ روشن زاویئے

۱۹۹۰ء

ابراہیم حامیؔ